اقبالؒ

سید سلیمان ندوی کی نظر میں

ترتیب و تحشیہ

اختر راہی

★

بزمِ اقبال

کلب روڈ۔ لاہور

اقبالؒ

سید سلیمان ندویؒ کی نظر میں

ترتیب و تحشیہ

اختر راہی

★

بزمِ اقبال

کلب روڈ — لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول : مارچ ۱۹۷۸ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی
سیکرٹری بزم اقبال ، لاہور

طابع : محمد زرین خان

مطبع : زرین آرٹ پریس ، ٦١ - ریلوے روڈ ، لاہور

قیمت : ۱۵ روپے

انتساب

دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے نام

مرتب

نام : سفیر اختر

قلمی نام : اختر راہی

ولادت : ۲۶ نومبر ۱۹۴۷ء ، لوہسر شرفو (ضلع راولپنڈی) ۔

تعلیم : ایم ۔ اے (سیاسیات) ، ایم ۔ اے (تاریخ) ، بی ۔ ایڈ ۔

ملازمت : لیکچرار شعبۂ تاریخ ، گورنمنٹ کالج ، مری ۔

تصنیفات : مسعود عالم ندوی (سوانح و مکاتیب) ۱۹۷۵ء ۔

تذکرۂ مصنفینِ درسِ نظامی ، ۱۹۷۵ء ۔

مکتوباتِ صدر یار جنگ (زیرِ طبع) ۔

نظمِ معنوی (ترتیب و حواشی) زیر طبع ۔

مستقل پتہ : لوہسر شرفو ، واہ کینٹ ، ضلع راولپنڈی ۔

فہرست

حصۂ دوم

ضمیمے

☆ ☆ ☆

عرضِ مرتّب

زیرِ نظر مجموعہ دو حصوں میں منقسم ہے : پہلے حصے میں مولانا سیّد سلیمان ندوی مرحوم کی وہ تمام تحریریں یک جا کی گئی ہیں جو انھوں نے علامہ اقبال کے احوال و آثار کے متعلق وقتاً فوقتاً لکھی ہیں - دوسرے حصے میں سید صاحب کے نام علامہ کے اکہتر (۷۱) مکاتیب ہیں -

متذکرۃ الصدر تحریریں اگرچہ رسائل و جرائد میں شائع ہو چکی ہیں ، مگر وہ عام اقبال شناسوں کی دسترس سے باہر ہیں - ہمارے ہاں رسائل کی فائلیں محفوظ رکھنے کا رجحان کم رہا ہے ، اس لیے ایسے مضامین اور تحریریں نایاب ہوتی جا رہی ہیں - اس سلسلے میں راقم الحروف کو "معارف" کی مکمل فائل دیکھنے کے لیے جو تگ و دو کرنی پڑی وہ خود ایک داستان ہے - بہرحال تلاش و تفحّص سے سیّد صاحب کے جواہر ریزے جمع کرنے میں بالآخر کامیابی حاصل ہوئی اور ان پر مناسب حواشی لکھے گئے -

سیّد صاحب کے نام علامہ کے مکاتیب "اقبال نامہ" حصہ اوّل میں شامل ہیں مگر ان میں ترتیب و تدوین کی خامیوں کے علاوہ حواشی نا کافی ہیں - مکاتیب کے متن کی تصحیح میں "معارف" میں

چھپے ہوئے مکاتیب کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور حتی الامکان تصحیح کی کوشش کی گئی ہے۔

سیّد صاحب نے ''اقبال نامہ'' کے مرتب کو مکاتیب بھیجتے وقت جو حواشی لکھ کر دیے تھے، انھیں بھی برقرار رکھا گیا ہے اور ان کے آخر میں ''س'' درج ہے۔ اگر کہیں سیّد صاحب کے حواشی میں اضافے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو زائد الفاظ قوسین میں درج کیے گئے ہیں۔

حضرتِ علامہ کے مکاتیب کے ساتھ سیّد صاحب کے جوابی مکاتیب کی عدم موجودگی بری طرح کھٹکتی ہے مگر بحالاتِ موجودہ اس کی تلافی ناممکن ہے۔ خود سیّد صاحب نے اپنے مکاتیب کے بارے میں لکھا ہے:

''ڈاکٹر اقبال مرحوم کے نام میرے جوابی خطوط کی نقل میرے پاس نہیں اور نہ اب اُن کے پس ماندگان کے پاس میرے جوابات ہوں گے اور نہ اب مجھے پوری طرح یاد ہیں اس لیے اب اُن کی تلافی کی کوئی صورت باقی نہیں۔''[1]

''اقبال نامہ'' کے مرتب شیخ عطاء اللہ مرحوم، سیّد صاحب کے ان مکاتیب کے بارے میں لکھتے ہیں:

سیّد سلیمان ندوی کے جوابات مل جاتے تو انھیں علیحدہ ضرور شائع کر دیتا لیکن ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ہاں سے

۱- انداز سخن، ص ٦٦ -

خود اُن کے کلام کا کچھ حصہ اور کچھ اُن کی دوسری
تحریرات ایک شخص لے کر گیا ہوا ہے ۔
خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ چیزیں کب اور کن خوش نصیب
لوگوں کو پڑھنے کو میسر آئیں گی ۔''[1]

جناب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے معلوم کیا گیا تو اُنھوں نے جواباً لکھا :

''میرے پاس علامہ مرحوم کو تحریر کردہ مشاہیر کے
خطوط موجود نہیں ۔ ایسے بیشتر خطوط اُنھوں نے اپنی
زندگی میں وفات سے پہلے تلف کر دیے تھے ۔''[2]

متذکرۃ الصدر روایتوں کے اختلاف کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ سیّد صاحب کے مکاتیب ضائع ہو چکے ہیں ۔

کتاب کے مقدمے میں علامہ اقبال کے سیّد صاحب اور ان کے استاد علامہ شبلی نعمانی کے ساتھ تعلقات پر ایک مضمون ہے اور آخر میں چند ضمیمے ہیں جن سے علامہ اور سیّد صاحب کے باہمی تعلقات اور افکار پر روشنی پڑتی ہے ۔

کتاب کی ترتیب و تدوین میں بہت سے احباب نے تعاون فرمایا ہے ۔ اُن سب کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا خوش گوار فریضہ سمجھتا ہوں ۔ خاص طور پر جناب ڈاکٹر معزّ الدین ، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی ، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف ، پروفیسر احمد سعید ، پروفیسر رحیم بخش شاہین اور جناب خواجہ محمد خان اسد صاحب کا

۱۔ انداز سخن ، ص ۳۶۷ ۔ ۲۔ مکتوب بنام راقم الحروف ۔

شکرگزار ہوں جنھوں نے رسائل اور کتابوں کی فراہمی اور مفید مشوروں سے مجھے حوصلہ دیا اور میں یہ کتاب اقبال شناسوں کے حضور میں پیش کر سکا۔

لوہسر شرفو ، واہ کینٹ
۱۹ فروری ۱۹۷۷ء

اختر راہی

☆ ☆ ☆

مقدمہ

۱۸۵۷ء کا سال برِعظیم پاک و ہند کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی سال مسلمانوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لیے آخری عسکری کوشش کی جو بوجوہ ناکام ہوگئی۔ برائے نام مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور سات سمندر پار کی ایک اجنبی قوم نے کامل تسلّط حاصل کر لیا۔

یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ انھی دنوں جب مجاہدینِ آزادی اپنی بے سرو سامانی کے باوجود دادِ شجاعت دے رہے تھے، ضلع اعظم گڑھ کی ایک بستی بندول میں ایک بچہ پیدا ہوا جو بڑا ہو کر مسلمانانِ پاک و ہند کا علمی و فکری راہنما بننے والا تھا۔ اسی راہنما کو ہم "علامہ شبلی نعمانی" کے نام سے پکارتے ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب و شاعر، بالغ نظر نقاد اور صاحبِ بصیرت متکلّم اور مؤرخ تھے۔ انھوں نے مروجہ انداز کے مطابق تعلیم حاصل کی اور پھر اپنے تعلیمی ماحول کے زیرِ اثر وہابیوں اور حنفیوں کے فروعی جھگڑوں میں اُلجھ گئے۔ وہابیوں کی رد میں ایک عربی رسالہ

''اسکات المعتدی'' لکھا اور امام ابو حنیفہ نعمانؒ بن ثابت کے نام کی رعایت سے ''نعمانی'' اپنے نام کا جزو بنا لیا ۔

یہ حسنِ اتفاق تھا کہ ۲۴ سال کی عمر میں وہ اپنے زیرِ تعلیم بھائی مہدی سے ملنے علی گڑھ آئے ۔ وہاں سر سیّد احمد خاں سے بھی ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات علی گڑھ میں رہ جانے کا سبب بنی ۔ سر سیّد احمد خاں نے انھیں کالج میں پروفیسر مقرر کر دیا ۔ یہیں پروفیسر آرنلڈ سے ان کی ملاقات ہوئی اور دونوں نے ایک دوسرے سے بھرپور استفادہ کیا ۔ سر سیّد احمد خاں کا کتب خانہ اسلامی علوم کی کتابوں کے اعتبار سے نہایت قابلِ قدر تھا ۔ شبلی نے اس کتب خانے سے اپنی علمی پیاس بجھائی ۔ علی گڑھ کے ماحول نے ان کے اندازِ نظر میں انقلاب پیدا کر دیا ۔ انھوں نے مسلمانوں کے فروعی اختلافات کو موضوعِ تحریر بنانے کی بجائے وقت کا چیلنج قبول کیا اور قدیم علوم کو نئے رنگ میں پیش کرنے کا پروگرام بنایا ۔ انھوں نے طے کر لیا کہ بدلی ہوئی فضا میں جدید علوم اور جدید تمدن کو مذہبی اصول کے ساتھ مطابقت دینی ہے اور فلسفۂ حال کے ان مسائل کی توجیہ و تاویل کرنی ہے جو مذہبی نظریات سے ٹکراتے ہیں ۔ بالخصوص تاریخ کی تدوین زمانے کے مذاق کے مطابق کرنی ہے ۔

موصوف سر سیّد احمد خاں کی وفات تک علی گڑھ کالج میں رہے اور اس زمانے میں ادبی تحریروں کے علاوہ تین اہم کتابیں ''المامون'' ، ''سیرت النعمان'' اور ''الفاروق'' تحریر کیں جن سے ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی ۔

اگلے چند برسوں میں انھوں نے ''الغزالی'' ، ''علم الکلام''
''الکلام'' اور ''سوانحِ مولانا روم'' لکھ کر جدید علمِ کلام کی بنیاد
رکھ دی جو سرسیّد احمد خاں کی عقلیت پسندی سے بنیادی طور پر
ہم آہنگ ہونے کے باوجود سر سیّد کے غلو اور افراط سے پاک ہے ۔
شبلی کا اندازِ نظر عالمانہ اور عام مسلمانوں کے لیے مانوس ہے ، اس
لیے جہاں سیّد صاحب کی رائے سے عام مسلمان متوحّش ہو جاتے
ہیں ، وہاں شبلی کے خیالات قبول کر لیے جاتے ہیں ۔ شبلی کی
قبولیتِ عامہ کا بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے کہیں بھی قدیم سے
اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا اور ان کی عقلیت پسندی گوارا کر لی گئی ۔

یہی وہ دور تھا (۱۹۰۲ع) جب علامہ اقبال ، کمال کی منزلوں
کی طرف بڑھ رہے تھے ۔ ۱۹۰۳ع میں آن کی پہلی تصنیف
''علم الاقتصاد'' شائع ہوئی ۔ اس کے دیباچے کا ایک اقتباس یہ ہے :

> ''اس دیباچے کو ختم کرنے سے پیشتر میں استاذی المکرّم
> قبلہ آرنلڈ صاحب ، پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کا شکریہ
> ادا کرتا ہوں جنھوں نے مجھے اس کتاب کے لکھنے کی
> تحریک کی ۔ میں استاذی جناب قبلہ لالہ جیا رام صاحب
> ایم ۔ اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اور اپنے عزیز دوست
> اور ہم جماعت مسٹر فضلِ حسین بی ۔ اے کینٹب ، بیرسٹر
> ایٹ لاء کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے مجھے نہ صرف اپنے
> بیش قیمت کتب خانوں کی کتابیں ہی عنایت فرمائیں بلکہ
> بعض مسائل کے متعلق نہایت قابلِ قدر مشورات بھی دیے ۔
> اس کے علاوہ مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولانا شبلی نعمانی

مدظلہ بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے
اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر
اصلاح دی ۔''[1]

''علم الاقتصاد'' اشاعت کے مراحل سے پہلے علامہ شبلی نعمانی کی نظر سے گزری ہوگی ۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ ۱۹۰۲ء کے لگ بھگ علامہ اقبال کے ان سے علمی روابط کا آغاز ہوا ۔ کیا یہ تعلق پروفیسر آرنلڈ کی وساطت سے قائم ہوا یا اشتراک ذوق اس کا سبب بنا ؟ دونوں حضرات کی تحریروں سے اِس معاملے پر کوئی روشنی نہیں پڑتی ۔ اسی طرح یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ اس زمانے میں ان کی کوئی بالمشافہ ملاقات ہوئی یا نہیں ۔ البتہ علامہ شبلی نعمانی ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ امرتسر (۹ — ۱۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء) میں شرکت کے لیے پنجاب آئے تھے ۔

۱۹۰۷ء میں علامہ نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ The Development of Metaphysics in Persia لکھا ۔ اس میں ابن مسکویہ (م : ۱۰۳۰ء) کے نظریۂ ارتقا پر علامہ شبلی کی تالیف ''الکلام'' سے ایک اقتباس نقل کیا ہے ۔[2]

اس زمانے میں علامہ کی شاعری کا چرچا ماہنامہ 'مخزن' (لاہور) کے ذریعے پورے برِعظیم میں ہو رہا تھا اور اہلِ علم نے ان پر مضامین لکھنے اور ان کی شاعری پر رائیں دینی شروع کر دی تھیں ۔

۱۔ علم الاقتصاد ، دیباچہ ۔ ۲۔ فلسفۂ عجم ، ص ۵۶ ۔

اسی زمانے میں علامہ شبلی نے کہا :

''جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ اقبال کو ڈھونڈیں گے ۔''[۱]

۱۹۱۱ع میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دہلی میں ہوا ۔ کانفرنس کے کارپردازوں نے علامہ اقبال کی ملّی خدمات کے اعتراف میں انھیں ''ترجمانِ حقیقت'' کا خطاب دینے کا پروگرام بنایا ۔ علامہ کی صدارت میں کانفرنس کا تیسرا اجلاس ہوا اور اس موقع پر خواجہ کمال الدین نے ''اسلام اور عصرِ جدید'' کے موضوع پر ایک تقریر کی ۔ علامہ نے بھی اسی موضوع پر خطبۂ صدارت دیا ۔[۲]

کانفرنس کے چھٹے اجلاس کی صدارت شاہ محمد سلیمان پھلواروی نے کی اور اس اجلاس میں علامہ کو ملّی اعزاز و تحسین پیش کرنے کی رسوم ادا کی گئیں ۔ سب سے پہلے سجاد حیدر یلدرم نے علامہ کو پھولوں کا ہار پہنانے کے لیے علامہ شبلی سے درخواست کی ۔ انھوں نے یہ درخواست منظور کرتے ہوئے علامہ کو ہار پہنایا اور اس کے بعد سامعین سے مخاطب ہوئے :

''یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں ہے اور اِس کو محض

۱- علامہ شبلی کی یہ رائے محمد دین فوق نے علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی (مطبوعہ : کشمیری میگزین ، بابت اپریل ۱۹۰۹ع) میں درج کی تھی ۔ بحوالہ انوارِ اقبال ، ص ۸۵ ۔

۲- مقالاتِ اقبال ، صفحات ۲۳۹ - ۲۴۰ ۔

تفریح تصور نہیں کرنا چاہیے - ہم مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطابات کی قدر کرتے رہے ہیں اتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے ناموں کے ساتھ نہیں ہوئی - محقّق طوسی وغیرہ کو اس زمانے کے سلاطین نے بڑے بڑے خطابات دیے لیکن آج سوا کتابوں کے اوراق کے کسی زبان پر نہ چڑھ سکے ، لیکن قوم کی طرف سے ''محقّق'' کا جو خطاب دیا گیا تھا وہ آج تک زبان زدِ خاص و عام ہے - جو عزت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے وہ ان کے لیے بڑی عزت اور فخر کی بات ہے اور حقیقت میں وہ اس عزت کے مستحق ہیں - ڈاکٹر اقبال کے علم و ادب اور ان کی شاعری کا مقابلہ غالب کی شاعری سے کیا جائے تو مبالغہ نہیں ہو سکتا -''[1]

ان ہی برسوں میں علامہ شبلی نعمانی ''وقف علی الاولاد''[2] کی قانونی حیثیت منوانے کے لیے تگ و دو کر رہے تھے - اس سلسلے میں مسلمان وکلا کا ایک وفد لے کر جنوری ۱۹۱۲ء کی آخری تاریخوں میں وائسرائے سے ملنا چاہتے تھے - اس کے بعد ماہ اپریل میں ندوۃ العلماء کا اجلاس لکھنؤ میں تھا - علامہ کو وفد میں شامل ہونے اور اجلاس میں شرکت کرنے کی دعوت دی گئی - علامہ نے جواب

۱- اوراقِ گم گشتہ ، صفحات ۱۸۳ - ۱۸۴ -
۲- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حیاتِ شبلی ، صفحات ۵۳۶ - ۵۳۶ -

میں انھیں حسبِ ذیل خط لکھا :

"لاہور

۱۲ جنوری ۱۹۱۲ ء

مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولوی صاحب ، السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ملا ۔ انجمن کا جلسہ ایسٹر کی تعطیلوں میں ہوگا ۔ اگر وہاں کی شمولیت کے بعد میں لکھنؤ حاضر ہو سکا تو ضرور حاضرِ خدمت ہوں گا ۔

افسوس کہ ڈیپوٹیشن میں شریک ہونے سے قاصر ہوں ۔ اگر آپ کا ارشاد ہو تو میں چودھری شہاب الدین صاحب بی ۔ اے ، وکیل چیف کورٹ سے دریافت کروں ۔ وہ نہایت قابل آدمی ہیں اور اس کام کے اہل ۔ اگر یہ پسند نہ ہو تو نواب ذوالفقار علی خاں اس وقت کلکتے میں ہیں ۔ آپ ان کو پنجاب کی طرف سے انتخاب کریں اور ان کو لکھ دیں کہ وہ ۲۹ جنوری تک کلکتے میں ہی ٹھہریں ۔ مسٹر محمد شفیع بیرسٹر لاہور بھی اس وقت کلکتے میں ہیں ۔ غالباً وہ بھی آپ کے لکھنے پر ۲۹ جنوری تک وہاں قیام نہ کر سکیں ۔ جو تجویز پسندِ خاطر ہو اس کو عمل میں لائیے ۔ باقی خیریت ہے ۔

آپ کا مخلص ، محمد اقبال ، بیرسٹر لاہور"[۱]

ایم ۔ مہدی حسن کو علامہ شبلی ۱۶ جنوری ۱۹۱۲ء کے خط

۱۔ اقبال نامہ ، حصہ اول ، صفحات ۷۳ - ۷۴ ۔

میں لکھتے ہیں :

''میں وقفِ اولاد کا ڈیپوٹیشن لے کر کلکتے جا رہا تھا ، ہوم ممبر چل دیے ، اب شاید تاریخ بدل جائے ۔ جلسۂ سالانہ ندوہ اپریل میں ہے ۔ اب کے خاص تیاریاں ہیں ۔ ڈاکٹر اقبال اور قابل لوگوں[۱] کو بلایا ہے ۔''[۲]

بہرحال علامہ شبلی وفد کلکتہ نہ لے جا سکے اور ندوۃ العلماء کے اجلاس میں علامہ شریک نہ ہو سکے ۔ اس کے بعد طرابلس اور بلقان کی جنگوں نے مسلمانانِ ہند کو ہلا ڈالا اور پورے ملک میں ترکوں کے لیے چندے جمع ہونے لگے ۔ علامہ اقبال اور علامہ شبلی کے تاثرات ایک جیسے تھے ۔ اسی طرح ۱۹۱۳ء کے حادثۂ مچھلی بازار کانپور پر بھی دونوں حضرات نے یکساں ردِ عمل کا اظہار کیا ۔ آخر ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی کا انتقال ہو گیا ۔ تقریباً ایک ماہ بعد مولانا الطاف حسین حالی بھی داغِ مفارقت دے گئے ۔ علامہ نے ''شبلی و حالی'' کے عنوان سے مندرجہ ذیل نظم لکھی :

مسلم سے ایک روز یہ اقبال نے کہا
دیوانِ جزو و کل میں ہے تیرا وجود فرد
تیرے سرودِ رفتہ کے نغمے علومِ نو
تہذیب تیرے قافلہ ہائے کہن کی گرد

۱۔ ایک دوسرے خط میں علامہ اقبال کا ذکر ''معزز لوگوں'' کے زمرے میں کیا ہے ۔ مکاتیبِ شبلی ، حصہ دوم ، بنام آزاد ۔

۲۔ مکاتیبِ شبلی ، حصہ دوم ، ص ۲۲۹ ۔

پتھر ہے اُس کے واسطے موجِ نسیم بھی
نازک بہت ہے آئنۂ آبروئے مرد
مردانِ کار ڈھونڈ کے اسبابِ حادثات
کرتے ہیں چارۂ ستمِ چرخِ لاجورد
پوچھ اُن سے جو چمن کے ہیں دیرینہ راز دار
کیونکر ہوئی خزاں ترے گلشن سے ہم نبرد
مُسلم مرے کلام سے بے تاب ہو گیا
غمّاز ہو گئی غمِ پنہاں کی آہِ سرد
کہنے لگا کہ دیکھ تو کیفیّتِ خزاں
اوراق ہو گئے شجرِ زندگی کے زرد
خاموش ہو گئے چمنستاں کے راز دار
سرمایۂ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں
حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد
"اکنوں کرا دماغ کہ پُرسد ز باغباں
بُلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد"۱

علامہ اقبال کے مکتوبات میں گاہے ماہے علامہ شبلی نعمانی کے رشحاتِ قلم کا ذکر بھی آتا ہے۔ ظہور الدین مہجور شعرائے کشمیر کا تذکرہ لکھنا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے علامہ سے مشورہ کیا۔ علامہ

۱۔ کلیاتِ اقبال : ص ۲۲۲ ۔

نے جواباً لکھا :

''ہاں ! تذکرۂ (شعرائے) کشمیر لکھتے وقت مولانا شبلی کی 'شعرالعجم' آپ کے پیشِ نظر رہنی چاہیے - محض حروفِ تہجّی کی ترتیب سے شعرا کا حال لکھ دینا کافی نہ ہوگا - کام کی چیز یہ ہے کہ آپ کشمیر میں فارسی شعرا کی تاریخ لکھیں - مجھے یقین ہے کہ ایسی تصنیف نہایت بارآور ہوگی -''[۱]

جناب سراج الدین پال حافظ شیرازی کے فکر و فن کا مطالعہ کر رہے تھے - انھیں کتابیں تجویز کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

''تاریخی اعتبار سے اس کے کلام پر نظر ڈالنی ہو تو مولوی شبلی کی 'شعر العجم' ملاحظہ کیجیے - غالباً اس سے آپ واقف ہوں گے -''[۲]

''سیرت النبی'' کے بارے میں سیّد سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں :

''مولانا مرحوم نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے جس کا صلہ دربارِ نبوی سے عطا ہوگا -''[۳]

سیّد سلیمان ندوی کے نام مکتوبات میں ''الکلام'' کے حوالے سے بھی گفتگو کی گئی ہے -[۴] اسی طرح فقہ کی تدوینِ جدید کے بارے

۱- اقبالنامہ ، حصہ اول ، ص ۵۹ - انوارِ اقبال (صفحات ۷۰ - ۷۱) میں یہی خط محمد دین فوق کے نام درج ہے -

۲- اقبالنامہ ، حصہ اول ، ص ۳۹ - ۳- مکتوب نمبر ۸ -

۴- مکتوبات نمبر ۳۴ - ۳۶ -

میں لکھا ہے کہ اگر وہ (علامہ شبلی) زندہ ہوتے تو اس کام کے لیے آن سے کہتا۔۱

علامہ شبلی نعمانی کے جانشین، سیّد سلیمان ندوی ہوئے۔ سیّد صاحب ماضیِ قریب کے آن کے بلند پایہ علمائے دین اور اصحابِ فکر میں سے تھے جن کے رشحاتِ قلم ایک عرصے تک زندہ رہیں گے۔ سیّد صاحب ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ/۲۲ نومبر ۱۸۸۴ع کو عظیم آباد پٹنہ (بہار) کے ایک مردم خیز گاؤں دیسنہ میں پیدا ہوئے۔ آن کے خاندان میں پشت ہا پشت سے علمی روایت چلی آ رہی تھی۔ آن کے والدِ ماجد حکیم ابوالحسن صاحب (۱۳۴۰ھ/۲۲-۱۹۱۱ع) عالمِ دین اور ایک صوفی منش بزرگ تھے اور سیّد صاحب کے بڑے بھائی مولانا حکیم ابو حبیب مجدّدی (م ۱۳۴۶ھ/۲۷-۱۹۲۶ع) بھی ایک جیّد عالم اور حاذق طبیب تھے۔

سیّد صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے بڑے بھائی سے اور مدرسۂ امدادیہ دربھنگہ اور پھلواری شریف میں پائی۔ پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی کشش آنھیں لکھنؤ لے گئی۔ ندوۃ العلماء کا وہ ابتدائی دور تھا۔ علامہ شبلی نعانی حیدرآباد دکن سے مستعفی ہو کر مستقل طور پر ندوۃ کی زمامِ تعلیم اپنے ہاتھ میں لے چکے تھے۔ آن کی جوہر شناس نگاہ نے سیّد صاحب کی صلاحیتوں کا فوراً ہی اندازہ کر لیا اور وہ علامہ شبلی کے خاص و مقرّب شاگردوں میں شمار ہونے لگے۔

۱۹۰۶ع میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے سندِ فضیلت حاصل کی

۱- مکتوب نمبر ۳۸۔

اور چند سال وہیں تدریس کی خدمت انجام دی ۔ دارالعلوم کے رسالے ''الندوہ'' کے مدیر بھی رہے ۔ عربی ادب اُن کا خاص موضوع تھا ۔ اس زمانے میں بچوں کی تعلیم کے لیے ''دروس الادب'' کے نام سے ریڈریں لکھیں اور آگے چل کر عربی کا ایک لغت مرتّب کیا ۔ پھر علامہ شبلی کے لٹریری اسسٹنٹ ہو گئے اور ''سیرت النبی'' کے کاموں میں اُستادِ محترم کی مدد کے ساتھ ساتھ اپنی علمی تحقیق بھی جاری رکھی ۔ ''حیاتِ مالک'' اسی دور میں ترتیب دی ۔

ندوہ کی اندرونی سیاست نے پلٹا کھایا اور علامہ شبلی کا اثر کم ہوتا چلا گیا ۔ سیّد صاحب کے مولانا ابوالکلام آزاد سے تعلقات تھے ۔ اُنھوں نے انھیں ادارۂ ''الہلال'' (کلکتہ) میں کھینچ لیا مگر یہاں زیادہ عرصہ نہ رہے اور دکن کالج پونہ میں لکچرار ہو کر چلے گئے ۔ علامہ شبلی ندوۃ العلماء سے الگ ہو چکے تھے اور اُن کے ذہن میں ایک علمی تصنیفی ادارے کا خاکہ تھا ۔ اعظم گڑھ کو مرکز بنا کر کام کرنے کا ارادہ تھا کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں اجل کا بلاوا آ گیا ۔ علامہ شبلی نے سیّد صاحب کو آخری وقت نہایت شفقت و محبت سے اپنے چھوڑے ہوئے کاموں ، خاص کر ''سیرت النبی'' کی تکمیل کی وصیت کی ۔

سیّد صاحب نے اُستاد کی آرزوؤں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ۱۹۱۵ء میں علمی تصنیفی ادارے دارالمصنّفین کی داغ بیل ڈالی اور اگلے سال ادارے کی تصنیفی کوششوں کی جھلک ماہنامہ ''معارف'' کی صورت میں سامنے آئی ۔ اس میدان میں اُن کے جوہر خوب کُھلے ۔ ۱۹۵۰ء تک ''معارف'' اُن کی ادارت میں چھپتا رہا ۔ اس مدت میں

ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے شذرات ، مقالات ، مکتوبات اور تبصروں کے علاوہ اُن کے قلم سے کئی بیش قیمت کتابیں بھی منظرِ عام پر آئیں - ان سب مشاغل کے باوجود وہ اپنے اصلی کام سے غافل نہ رہے - ''سیرت النبی'' کی تکمیل کی - چھ جلدیں شائع ہو چکی تھیں اور ساتویں جلد زیرِ ترتیب تھی کہ فرشتۂ اجل آ پہنچا -

سیّد صاحب ۱۹۵۰ع میں اپنے عزیزوں سے ملنے کراچی تشریف لائے تھے اور حالات ایسے پیدا ہوگئے کہ واپس بھارت نہ جا سکے - پاکستان میں تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ سے منسلک رہے اور بعض علمی کاموں کی داغ بیل ڈالی ہی تھی کہ ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ/۲۳ نومبر ۱۹۵۳ع کو وفات پا گئے -

سیرت النبی کے علاوہ سیّد صاحب کی کتابوں میں ارض القرآن ، خیّام ، سیرتِ عائشہؓ ، حیاتِ مالک ، عرب و ہند کے تعلقات ، عربوں کی جہاز رانی ، لغاتِ جدیدہ اور حیاتِ شبلی زیادہ مشہور ہیں - سیرت اُن کا پسندیدہ موضوع تھا - اس موضوع پر ''خطباتِ مدراس'' اور ''رحمتِ عالم'' بھی اُن کی مفید کتابیں ہیں - سیّد صاحب کے سینکڑوں مقالات بھی مجموعوں کی صورت میں شائع ہو رہے ہیں - نقوشِ سلیمانی ، یادِ رفتگاں اور مقالاتِ سلیمان اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں - مکاتیب کے چند مجموعے مکاتیبِ سلیمان ، مکتوباتِ سلیمانی اور بریدِ فرنگ اہلِ نظر تک پہنچ چکے ہیں -

سیّد صاحب اُن اقبال شناسوں میں سے تھے جنھوں نے علامہ کی زندگی میں اُن کے فکر و فلسفہ کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا - سیّد صاحب نے علامہ کی اکثر کتابوں پر جامع تبصرے لکھے اور

علامہ نے بھی علمی و تحقیقی کام کرتے ہوئے جب کبھی کوئی الجھن محسوس کی تو سیّد صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ بحث و نظر جاری رہی۔ دو بڑے دماغوں کے درمیان اختلاف بھی رہا اور باہم مجتمع بھی ہوئے۔ کبھی ایک نے بات مان لی اور کبھی دوسرے نے سِپر ڈال دی۔

یہ اخذ و اقتباس اور علمی مراسلات کا سلسلہ کب سے جاری تھا[1]؟ سیّد صاحب اس سلسلے میں خود لکھتے ہیں:

''مراسلت کی باطنی ملاقات تو ۱۹۱۴ء سے قائم ہے۔''[2]

علامہ شبلی کی وفات کے بعد سیّد صاحب نے دارالمصنّفین کا منصوبہ پیش کیا۔ اس سلسلے میں وہ مولانا عبدالماجد دریا بادی کو لکھتے ہیں:

''ملک کے مشاہیرِ علم یا امرائے قدردانانِ علم اس کے سرپرست و ارکانِ اعزازی ہوں گے۔''

ان ''مشاہیرِ علم'' میں علامہ کا نام بھی شامل ہے۔[3] ۹ فروری ۱۹۱۵ء کے خط میں رقم طراز ہیں:

''دارالمصنّفین کی نسبت ڈاکٹر اقبال، سید اکبر حسین،

۱۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی صاحب نے سیّد صاحب کے نام علامہ کے پہلے دستیاب خط سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''آپس میں علمی تعلقات نومبر ۱۹۱۶ء سے تھے'' (علامہ اقبال اور سیّد سلیمان ندوی، ص ۴)۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان درست نہیں۔

۲۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ ۱۔

۳۔ مکتوباتِ سلیمانی، حصہ اول، ص ۳۴۔

عماد الملک اور مولوی حبیب الرحمان اور مولوی ابوالکلام
سے گفتگو کر رہا ہوں ۔ مولوی عبدالحق کو بھی خط
لکھتا ہوں ۔''[1]

علامہ نے نومبر ۱۹۱۶ء میں سید صاحب کو اورینٹل کالج لاہور میں ہیڈ پرشین ٹیچر کی خالی اسامی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا :

''میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ اس جگہ کو
اپنے لیے پسند فرماتے ہیں ؟ اگر ایسا ہو تو آپ کے لیے
سعی کی جائے ۔ آپ کا لاہور میں رہنا پنجاب والوں کے لیے
مفید ہوگا ۔''[2]

برسبیلِ تذکرہ یہ عرض کر دیا جائے کہ علامہ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ اہلِ علم پنجاب کو اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں ۔ جن دنوں مولانا انور شاہ کاشمیری (م : ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء) دارالعلوم دیوبند کے بعض اندرونی اختلافات کے سبب دارالعلوم سے الگ ہونے پر مجبور ہوگئے تو علامہ نے بھرپور کوشش کی کہ وہ لاہور تشریف لے آئیں مگر قدرت کو ایسا منظور نہ تھا ۔[3]

سیّد صاحب دارالمصنّفین جیسے جان سے عزیزتر ادارے سے قطع تعلق کرنا مناسب خیال نہ کرتے تھے اس لیے علامہ کی خواہش پوری نہ ہو سکی ۔ علامہ نے لکھا :

''مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ ملازمت کوئی قبول نہ کریں گے

۱۔ مکتوباتِ سلیمانی ، حصہ اوّل ، ص ۳۸ ۔
۲۔ مکتوب نمبر ۱ ۔
۳۔ اقبال اور علامہ انور شاہ کاشمیری (صحیفہ ، اقبال نمبر) ۔

لیکن سینڈیکیٹ کے بعض ممبروں کی تعمیلِ ارشاد میں آپ کو لکھنا ضروری تھا۔ کسی قدر خود غرضی کا شائبہ بھی میرے خط میں تھا اور وہ یہ کہ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح پنجاب والوں کو صوبۂ متحدہ کے علما و فصحا سے اس سے پیشتر فائدہ پہنچا ہے اب بھی وہ سلسلہ آپ کے یہاں رہنے سے جاری رہے۔"[1]

فروری ۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی کا ایک وفد یورپ گیا تاکہ یورپ کے سیاسی رہنماؤں، صحافیوں اور بااثر افراد سے گفتگو کر کے مسئلۂ خلافت کے حق میں رائے عامہ بیدار کی جائے۔ یہ وفد مولانا محمد علی جوہر اور سید صاحب موصوف پر مشتمل تھا۔ وہ انگلستان، فرانس اور سوئٹزرلینڈ گئے۔ ہر جگہ خلافت کی شرعی اہمیت واضح کی اور خلافتِ عثمانیہ کی بقا کے لیے مذاکرات کیے مگر وفد اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ سید صاحب کی واپسی پر علامہ نے انھیں لکھا:

"آپ نے بڑا کام کیا ہے جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گزاری کی صورت میں مل رہا ہے اور دربارِ نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا۔"[2]

علامہ، سیّد صاحب کو اہم اسلامی موضوعات پر لکھنے یا کسی رفیق سے لکھوانے کا مشورہ دیتے رہے اور سیّد صاحب نے اکثر اُن کے مشوروں کو پذیرائی بخشی۔ ایک خط میں "فقہِ اسلامی

۱۔ مکتوب نمبر ۲۔ ۲۔ مکتوب نمبر ۲۰۔

کی تاریخ" لکھنے پر یوں آمادہ کرتے ہیں :

"اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہِ اسلامی کی ایک مفصّل تاریخ لکھی جائے۔ اس مبحث پر مصر میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی تھی جو میری نظر سے گزری ہے مگر افسوس ہے کہ بہت مختصر ہے اور جن مسائل پر بحث کی ضرورت ہے، مصنّف نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں اُن سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا۔"[1]

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :

"دارالمصنّفین کی طرف سے ہندوستان کے حکمائے اسلام پر ایک کتاب نکلنی چاہیے، اس کی سخت ضرورت ہے۔ عام طور پر یورپ میں سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی فلسفیانہ روایات نہیں ہیں۔"[2]

پھر تحریر فرماتے ہیں :

"میں نے زمان و مکان کے متعلق تھوڑا سا مطالعہ کیا ہے۔ اُس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ یہ کام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کو چاہیے کہ اس کام کو اپنی زندگی

۱۔ مکتوب نمبر ۳۸۔ ۲۔ مکتوب نمبر ۳۸۔

کے اہم مقاصد میں شمار کریں ۔"۱

سید صاحب خود تو اپنی دیگر علمی و تصنیفی سرگرمیوں کی وجہ سے ان موضوعات پر نہ لکھ سکے ، تاہم دارالمصنّفین کے رفیق مولانا عبدالسلام ندوی (م : ۱۹۵۶ء) سے ان مباحث پر کام کروایا۔ فقہِ اسلامی کی تاریخ کے سلسلے میں مولانا عبدالسلام ندوی نے علامہ خضری کی کتاب "فقہِ اسلامی" کا اُردو ترجمہ کیا اور حکمائے اسلام پر دو جلدوں میں ایک عمدہ کتاب ترتیب دی۔ دوسری جلد میں برِصغیر کے فلاسفہ اور اُن کے Contribution پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مکاتیب میں علامہ نے سید صاحب کو 'مخدومی'، 'مخدومی جناب قبلہ مولانا'، 'مخدوم و مکرم'، 'جناب قبلہ مولوی صاحب' اور 'مخدومی مولانا' کے الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔ اُن کے دل میں سید صاحب کا جو احترام اور جو عقیدت تھی اس کا اظہار ان جملوں سے بخوبی ہوتا ہے :

"ـــــ آپ اُمّتِ محمدیہ کے خاص افراد میں سے ہیں اور اس مامور من اللہ قوم کے خاص افراد کو ہی امرِ الٰہی ودیعت کیا گیا ہے ۔"۲

"ـــــ آج کے 'معارف' میں میری آرزو سے بڑھ کر مضمون لکھا گیا ہے۔ جزاک اللہ۔ معارف کا ایڈیٹر صاحبِ کشف

۱- مکتوب نمبر ۶۰ ۔ ۲- مکتوب نمبر ۱۲ ۔

نہ ہوگا تو اور کون ہوگا ۔"[۱]

"۔۔۔ علومِ اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سیّد سلیمان ندوی کے اور کون ہے ۔"[۲]

سیّد صاحب کی تالیفات سیرتِ عائشہ ، خیّام اور بعض متفرق مضامین کے بارے میں تاثرات ملاحظہ ہوں :

"۔۔۔ سیرت عائشہؓ کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔ یہ ہدیۂ سلیمانی نہیں ، سرمۂ سلیمانی ہے ۔ اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت اضافہ ہوا ۔ خدا تعالیٰ جزائے خیر دے ۔"[۳]

"۔۔۔ عمر خیّام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا ۔ الحمد للہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف پر ہوا ۔"[۴]

"۔۔۔ 'معارف' مجھے خاص طور پر محبوب ہے اور بالخصوص آپ کے مضامین کے لیے ۔ آپ کی نثر معانی سے معمور ہونے کے علاوہ لٹریری خوبیوں سے بھی مالامال ہوتی ہے ۔"[۵]

سیّد صاحب فطرۃً شاعر نہ تھے ۔ رعنائی و رنگینی ، خیال آرائی اور مبالغہ پسندی کے بجائے سکون و وقار ، دقّت نظری اور واقعیّت پسندی اُن کے مزاج کے اجزائے ترکیبی تھے ۔ مگر بہار اور یو ۔ پی کے شعر پرور ماحول میں گاہے ماہے شعر بھی کہتے تھے ۔ اُن کے ایک

۱- مکتوب نمبر ۲۶ ۔
۲- مکتوب نمبر ۳۸ ۔
۳- مکتوب نمبر ۲۱ ۔
۴- مکتوب نمبر ۵۹ ۔
۵- مکتوب نمبر ۳۱ ۔

ارادت مند جناب غلام محمد صاحب نے مجموعۂ کلام ''ارمغانِ سلیمان'' کے نام سے شائع کیا ہے۔

۱۹۱۶ء میں سیّد صاحب کی مندرجہ ذیل غزل شائع ہوئی (جو ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں پڑھی گئی تھی):

عجیب طرح کا اک پیچ گفتگو میں ہے
وگرنہ ''میں'' میں وہی بات ہے جو ''تو'' میں ہے

ہے کائنات کا ہر ایک ذرہ گردش میں
پتا جو مل نہ سکا، تیری جستجو میں ہے

خطابِ غیر میں گو لاکھ احترام رہے
مگر وہ لطف کہاں ہے جو لفظِ 'تُو' میں ہے

دہن میں تیغ کے اب بھی ہے تشنگی باقی
عجیب لذّتِ پنہاں مرے لہو میں ہے

نگاہِ لطف اِدھر ہو کہ آ چلا ہے کیف
بچا نہ رکھ مرے ساقی جو کچھ سبو میں ہے

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں، جو رگِ گلو میں ہے

قفس میں نالہ نہ کر مرغ! صحنِ باغ ہے دور
کہ لطفِ شکوۂ یارانہ روبرو میں ہے

علامہ نے یہ غزل پڑھ کر ان الفاظ میں داد دی ہے:

''آپ کی غزل لاجواب ہے۔ بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا

پسند آیا :

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے"[1]

۱۹۱۸ء میں "رموزِ بےخودی" شائع ہوئی۔ علامہ نے ایک نسخہ تبصرے کی غرض سے سیّد صاحب کو بھیجا اور ساتھ ہی لکھا :

"مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آپ اُستاد الکُل ہیں۔ اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہوگا۔"[2]

'معارف' بابت اپریل ۱۹۱۸ء میں سید صاحب کا ریویو شائع ہوا۔ اُنھوں نے زبان و بیان کی بعض کوتاہیوں کی طرف اشارہ کیا۔ علامہ نے ریویو دیکھنے کے بعد لکھا :

"معارف میں ابھی آپ کا ریویو . . . نظر سے گزرا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ میرے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ اللہ تعالٰی آپ کو جزائے خیر دے۔ صحتِ الفاظ و محاورات کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے، ضرور صحیح ہوگا لیکن اگر آپ ان لغزشوں کی طرف بھی توجہ فرماتے تو میرے لیے آپ کا ریویو زیادہ مفید ہوتا۔ اگر آپ نے غلط الفاظ و محاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے مجھے اُن سے آگاہ کیجیے کہ

۱۔ مکتوب نمبر ۲۔ ۲۔ مکتوب نمبر ۴۔

دوسرے ایڈیشن میں اُن کی اصلاح ہو جائے۔۱"

سیّد صاحب نے غلطیاں لکھ بھیجیں۔ علامہ نے اپنے حق میں اساتذہ کے کلام سے مثالیں پیش کیں مگر بحث و تمحیص کے دوران میں لکھا :

"آپ کے ارشادات نہایت مفید ہیں اور میں اُن سے مستفید ہونے کی پوری کوشش کروں گا۔۲"

"جس توجہ سے آپ نے تنقیدی خطوط لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے اس کے لیے نہایت شکر گزار ہوں۔۳"

"میری خامیوں سے مجھے ضرور آگاہ کیا کیجیے۔ آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن مجھے فائدہ ہوگا۔۴"

علامہ کا تیسرا مجموعۂ کلام "پیامِ مشرق" شائع ہوا تو سید صاحب نے ایک نوٹ لکھا۔ علامہ لکھتے ہیں :

" 'پیامِ مشرق' پر جو نوٹ آپ نے 'معارف' میں لکھا ہے اس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ پروفیسر نکلسن کا خط ابھی آیا ہے۔ اُنھوں نے اسے بہت پسند کیا ہے اور غالباً اس کا ترجمہ بھی کریں گے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب جدید اور اوریجنل خیالات سے مملو ہے اور گوئٹے کے دیوانِ مغربی کا قابلِ تحسین جواب ہے۔ مگر میرے لیے آپ کی رائے پروفیسر نکلسن کی رائے سے زیادہ قابلِ افتخار ہے۔۵"

۱۔ مکتوب نمبر ۵ ۔
۲۔ مکتوب نمبر ۸ ۔
۳۔ مکتوب نمبر ۱۰ ۔
۴۔ مکتوب نمبر ۱۲ ۔
۵۔ مکتوب نمبر ۳۲ ۔

سیّد صاحب علامہ کی شاعری کے مداح تھے۔ ایک معترض کے جواب میں نہایت جذباتی انداز میں لکھتے ہیں :

"'معارف' کو ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں ہمیشہ سے نیاز حاصل تھا اور ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ 'بانگِ درا' کی اشاعت کے لیے جہاں اور ہزاروں شائقین کی فرمائشیں ہوں گی ، وہاں ایڈیٹر 'معارف' کی تحریک کو بھی دخل ہے۔ 'اسرارِ خودی' کے انگریزی ترجمے پر انگریزی میں جس قدر تقریظیں لکھیں وہ 'معارف' ہی کی بدولت اردو میں پھیلیں . . . 'پیامِ مشرق' پر گو تفصیلی ریویو کا موقع نہ ملا ، تاہم شذرے میں جو مختصر رائے اس پر ظاہر کی گئی اس سے زیادہ کوئی اور کیا کہہ سکتا ہے۔"[۱]

انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کئی سال سے سید صاحب کو سالانہ جلسوں میں شرکت کی دعوت دے رہی تھی۔ ۱۹۲۳ء کے سالانہ جلسے میں سیّد صاحب کی آمد متوقع تھی مگر وہ کسی سبب سے تشریف نہ لا سکے تو علامہ نے افسوس سے لکھا :

"اب کے انجمنِ حمایتِ اسلام کے جلسے پر آپ سے ملنے کی توقع تھی۔ میں اسی خیال سے جلسے میں آ گیا کہ آپ کو اپنے ہاں مہمان کرنے کے لیے لیتا آؤں گا مگر جلسے میں جا کر مایوسی ہوئی۔"[۲]

۱- "معارف" دسمبر ۱۹۲۵ء -   ۲- مکتوب نمبر ۳۲ -

۵ ستمبر ۱۹۲۴ء کے خط میں ، انجمن سے لاتعلقی کے باوجود ، سیّد صاحب کو جلسے میں شرکت کے لیے آمادہ کرتے ہیں :

"آپ ضرور تشریف لائیے - یہاں کے لوگوں کو ختم نبوت کے مسئلے میں بڑی دلچسپی ہے اور آپ کی تقریر انشاء اللہ بے حد توجہ سے سنی جائے گی - اس کے علاوہ میں ایک مدت سے آپ کی ملاقات کا اشتیاق رکھتا ہوں - میرے ہی غریب خانے پر ٹھہریے - یہاں سے انجمن کا جلسہ گاہ کچھ دور نہیں - موٹر پر چھ منٹوں کی راہ ہے -"[1]

مگر سیّد صاحب اس سال بھی نہ آ سکے - پھر ۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء کے خط میں اشتیاقِ ملاقات کا ذکر یوں ملتا ہے :

"کاش چند روز کے لیے آپ سے ملاقات ہوتی اور آپ کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملتا -"[2]

آخر سیّد صاحب ، انجمن کے ۴۲ ویں جلسے میں شریک ہوئے جو ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۷ اپریل ۱۹۲۷ء کو اسلامیہ کالج گراونڈ میں منعقد ہوا تھا - انھوں نے مولانا ظفر علی خاں کے ہاں دفتر "زمیندار" میں قیام کیا - ۱۵ - اپریل کی صبح علامہ اور سیّد صاحب کی پہلی بالمشافہ ملاقات ہوئی - علامہ ، ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے ساتھ دفتر 'زمیندار' تشریف لے گئے اور ایک گھنٹے کی ملاقات میں بالفاظ چغتائی صاحب "تمام وقت علمِ دین و فلسفہ' اسلام کے موضوع پر گفتگو

۱- مکتوب نمبر ۳۶ -   ۲- مکتوب نمبر ۳۸ -

رہی تجو زیادہ تر امام رازی کی 'مباحثِ مشرقیہ' سے متعلق تھی ۔''۱

اسی روز سید صاحب نے جلسے میں ''عہدِ اسلام میں اشاعتِ اسلام'' کے موضوع پر تقریر کی ۔ شب کو علامہ کے ہاں دعوتِ طعام تھی جس میں مولانا ظفر علی خاں ، مولانا مہر ، مولانا عبدالمجید سالک ، پروفیسر تاثیر ، چودھری محمد حسین اور چغتائی صاحب نے شرکت کی ۔ کھانے کے بعد کافی دیر تک تبادلۂ خیالات ہوتا رہا ۔

۱۶ اپریل کو چوتھے اجلاس میں علامہ نے The Spirit of Islamic Culture کے موضوع پر تقریر کی ۔ قیامِ لاہور میں سید صاحب اور علامہ اکثر ساتھ رہے ۔ وطن واپسی پر سید صاحب نے ''معارف'' کے شذرات میں لکھا :

''پچھلے دس برسوں میں میں نے ہندوستان کا گوشہ گوشہ چھان ڈالا مگر یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ اس عرصے میں پنجاب جانا نصیب نہ ہوا ۔ پنجاب کے احباب نے بارہا تقاضا کیا اور اصرار کیا لیکن مجبوریاں تعمیل سے مانع رہیں ۔ انجمنِ حمایتِ اسلام کے کارفرما ہر سال یاد فرماتے رہے مگر عدمِ تعمیل کے لیے ہر سال کوئی نہ کوئی حیلہ ہاتھ آتا رہا ۔ امسال مزید بہانہ جوئی کے لیے کوئی چیز ہاتھ نہ آئی اور وسط اپریل میں لاہور جانا ہوا . . . .

ڈاکٹر صاحب سے یہ میری پہلی ظاہری ملاقات تھی اور مراسلت کی باطنی ملاقات تو ۱۹۱۳ع سے قائم ہے ۔ ڈاکٹر

۱- علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی ، ص ۷ ۔

صاحب نے کرم کیا اور ملنے میں پیش دستی فرمائی ۔ قیام گاہ میں آئے ، متعدد صحبتوں میں ساتھ رہے اور پھر خود اپنے کاشانے میں مدعو کیا جس کو وہ دارالفقر اور میں دارالاقبال کہوں گا ۔

ڈاکٹر صاحب ان "تمام صحبتوں میں شمعِ محفل تھے ۔ انھوں نے تو 'شمع اور شاعر' لکھا ہے لیکن میں نے تو لاہور میں خود شاعر کو شمع دیکھا اور قدر شناسوں کو اس کا پروانہ پایا ۔ اُن کی صحبت لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بلند کر رہی ہے ۔ اُن کے فلسفیانہ نکات ، عالمانہ افکار اور شاعرانہ خیالات ان کی آس پاس کی دنیا کو متاثر رکھتے ہیں ۔ اُن کی زمزمہ پردازیوں کا نیا مجموعہ 'زبورِ عجم' کے نام سے عنقریب سامعہ نواز ہونے والا ہے ۔ میں نے کہا کہ فلسفۂ عجم کے دشمن کو مناسب بھی یہی تھا کہ عجم کے ہاتھ میں زبور دے کر اُن کے خیالی فلسفے کو مزامیرِ داؤد کی دعاؤں سے بدل دے اور اُن کے کانوں کو زبور کا پردہ رکھ کر قرآن کی نغمہ سنجیوں سے مانوس کر دے ۔"[1]

اگلے سال ۱۹۲۸ء میں ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس امرتسر میں تھا ۔ سید صاحب نے علامہ کو دعوتِ شمولیت دی ۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی (مدیرِ ''برہان'' دہلی) اس اجلاس میں شریک

۱- ضمیمہ ۱ -

تھے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''راقم کو یاد ہے کہ ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ . . . امرتسر میں منعقد ہو رہا تھا ۔ اس زمانے میں میں طالب علم تھا اور لاہور میں مقیم تھا ۔ لاہور سے میں اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ، جو ڈاکٹر اقبال سے خاص تقرب رکھتے تھے اور اُن کے ایڈی کانگ کی حیثیت سے رہتے تھے ، اس اجلاس میں شرکت کے لیے امرتسر پہنچے ۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کسی عذر کی بنا پر اس میں شرکت نہیں کر سکتے تھے ۔ میں اور چغتائی صاحب مغرب کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی کی قیام گاہ پر حاضر ہو کر مولانا سے ملے ۔ مولانا نے علیک سلیک کے بعد چغتائی صاحب سے خطاب کر کے پوچھا ''کیوں ماسٹر صاحب ! ڈاکٹر صاحب تشریف نہیں لائیں گے ؟'' چغتائی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی طرف سے عذر بیان کیا تو مولانا نے فوراً اپنے خاص انداز میں مسکراتے ہوئے فرمایا ''اگر ڈاکٹر صاحب تشریف لے ہی آتے تو اچھا ہوتا ۔ یہاں سب علماء جمع ہوں گے ۔ اُن کو سنانے کا اس سے بہتر اور کیا موقع ہوگا . . . ۔'' جو حضرات اُس وقت وہاں موجود تھے ، اُنھوں نے مولانا کے اس فقرے سے بڑا لطف لیا ۔''[1]

علامہ اور سیّد صاحب کی ایک اہم ملاقات اپریل ۱۹۳۳ء میں

۱۔ معارف ، سلیمان نمبر ، ص ۱۶۴ ۔

ہوئی جب سید صاحب ادارۂ معارفِ اسلامیہ لاہور کے جلسے میں شرکت کے لیے لاہور آئے ۔ اُنھوں نے علامہ کی صدارت میں "ایک مہندس خاندان — جس نے تاج محل اور لال قلعہ بنایا" کے عنوان سے مقالہ پڑھا ۔

دسمبر ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ کی دعوت پر علامہ ، سیّد صاحب اور راس مسعود افغانستان تشریف لے گئے تاکہ افغانستان کی حکومت کو تعلیمی نظام میں اصلاحات کے لیے مشورہ دیا جا سکے ۔ سیّد صاحب نے اس سفر کی رپورتاژ "معارف" میں لکھی جو بعد میں "سیرِ افغانستان" کے نام سے شائع ہوئی ۔ علامہ نے اس رپورتاژ کو پسند کیا ۔

۱۹۳۵ء میں سیّد صاحب بیمار ہوئے تو اُن کے شاگردِ رشید مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے نام ۲۸ نومبر کے خط میں علامہ لکھتے ہیں :

"مولانا سیّد سلیمان ندوی کی علالت کی خبریں بہت متردد کر رہی ہیں ۔ خدا تعالیٰ اُن کو صحتِ عاجل عطا فرمائے ۔ میری طرف سے اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر استفسارِ حالات کیجیے ۔ اس وقت علمائے ہند میں وہ نہایت قابلِ احترام ہستی ہیں ۔ خدا تعالیٰ اُن کو دیر تک زندہ رکھے ۔"[۱]

۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو انٹر کالجئیٹ مسلم برادر ہُڈ نے دھوم

۱۔ اقبالنامہ ، حصہ اوّل ، ص ۲۰۱ ۔

دھام سے یومِ اقبال منایا۔ سیّد صاحب نے شرکت کی اور ایک مقالہ پڑھا۔ جب ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ نے اس دارِ فانی سے دارِ بقا کو رحلت کی تو پوری قوم نے ماتم کیا اور اُن کے احباب نے بطورِ خاص خون کے آنسو بہائے۔ سید صاحب نے ''معارف'' میں شذرۂ تعزیت لکھا جس میں اپنے چوبیس سال کے مراسم کی یادیں اور اس حادثۂ جانکاہ کا درد سمو دیا۔

سیّد صاحب نے اپنے احباب کے نام خطوط میں بھی اس حادثے کا ذکر بطورِ خاص کیا۔ مثال کے طور پر مولانا عبدالماجد دریابادی کو انھوں نے لکھا:

''وقعت الواقعہ، ڈاکٹر اقبال چل بسے! اناللہ۔''[1]

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کو لکھا:

''میری اور آپ کی ملاقات مرحوم ڈاکٹر اقبال ہی کے ذریعے سے ہوئی تھی اس لیے آپ کے اور میرے خطوں کے تبادلے میں اس سانحۂ عظیم کا ذکر ضروری ہے۔ مرحوم کی وفات پر چند رسمی غمگین لفظوں کا اظہار ناکافی ہے۔ یہ وہ غم ہے جس کے لیے الفاظ ناکافی ہیں۔''[2]

علامہ کی وفات سے لے کر اپنے آخری دم تک سیّد صاحب نے اپنی گفتگوؤں میں اُن کا تذکرہ زندہ رکھا۔ اُن کے خطوط اس پر شاہدِ عادل ہیں۔

☆ ☆ ☆

۱۔ مکتوباتِ سلیمانی، حصہ دوم، ص ۹۷۔
۲۔ اُردو ادب، دسمبر ۱۹۶۰ء، ص ۲۲۔

ڈاکٹر اقبال کی اسرارِ خودی

کا انگریزی ترجمہ

مثنوی ''اسرارِ خودی'' پہلی بار ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی ۔ پروفیسر نکلسن نے اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ۔ سیّد سلیمان ندوی نے ''معارف'' بابت دسمبر ۱۹۲۰ء کے شذرات میں لکھا :

''مشرق لٹریچر کے ہواہ خواہ بالعموم اور ڈاکٹر اقبال کے کلام کے مداح بالخصوص اس خبر کو سن کر خوش ہوں گے کہ اُن کی مشہور فارسی مثنوی 'اسرارِ خودی' کا انگریزی ترجمہ لندن میں چھپ کر شائع ہو گیا ہے ۔ مترجم کیمبرج یونیورسٹی کے ممتاز مستشرق پروفیسر نکلسن ہیں جو اسلامی ادبیات و تصوف پر متعدد تصانیف کے مصنف ہیں اور عربی و فارسی کی چند نادر و بیش بہا کتابیں ایڈٹ کر چکے ہیں ۔ اس ترجمے پر اُنھوں نے بکثرت حواشی دیے ہیں اور ایک مبسوط مقدمہ بھی تحریر کیا ہے ۔ 'ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ' دو بار اس پر نوٹ لکھ چکا ہے جو علمی حلقوں میں کتاب کی اہمیت و مقبولیت کی ایک واضح دلیل ہے ۔ سطور ھذا کی تحریر کے وقت تک کتاب ہندوستان نہیں پہنچی ہے ۔''

ڈاکٹر اقبال کی اسرارِ خودی

کا انگریزی ترجمہ

مثنوی ''اسرارِ خودی'' پہلی بار ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ پروفیسر نکلسن نے اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ سیّد سلیمان ندوی نے ''معارف'' بابت دسمبر ۱۹۲۰ء کے شذرات میں لکھا:

''مشرق لٹریچر کے ہواہ خواہ بالعموم اور ڈاکٹر اقبال کے کلام کے مداح بالخصوص اس خبر کو سن کر خوش ہوں گے کہ اُن کی مشہور فارسی مثنوی 'اسرار خودی' کا انگریزی ترجمہ لندن میں چھپ کر شائع ہو گیا ہے۔ مترجم کیمبرج یونیورسٹی کے ممتاز مستشرق پروفیسر نکلسن ہیں جو اسلامی ادبیات و تصوف پر متعدد تصانیف کے مصنف ہیں اور عربی و فارسی کی چند نادر و بیش بہا کتابیں ایڈٹ کر چکے ہیں۔ اس ترجمے پر اُنھوں نے بکثرت حواشی دیے ہیں اور ایک مبسوط مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ 'ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ' دو بار اس پر نوٹ لکھ چکا ہے جو علمی حلقوں میں کتاب کی اہمیت و مقبولیت کی ایک واضح دلیل ہے۔ سطور ھذا کی تحریر کے وقت تک کتاب ہندوستان نہیں پہنچی ہے۔''

مارچ ۱۹۲۱ع کی اشاعتِ ''معارف'' میں ''اسرارِ خودی'' کے انگریزی ترجمے پر حسبِ ذیل تبصرہ کیا گیا ہے۔''
(مرتب)

ہم مشرقیوں کی غلامانہ دماغی نفسیت کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ ہم اپنے انمول جواہرات کی قدر اُس وقت جانتے ہیں جب ہمارے آقایانِ یورپ اُس کو ہمارے خزانے سے منتقل کر کے اس سے اپنی دکان سجاتے ہیں اور ہم تماشائی بن کر اُن کو دیکھتے ہیں اور اُس وقت اپنی قسمت پر ناز کرتے ہیں۔ عمر خیام[1] چوتھی صدی سے اس تیرھویں صدی تک ہمارے کتب خانوں میں سر بمہر خریطے کی طرح محفوظ رہا اور ہم اس سے آگاہ نہ ہوئے، لیکن جب یورپ نے اس مُہر کو توڑا اور اس کو وقفِ عام کیا تو ہم بھی اُس کی قدر جاننے لگے اور اُس کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہوئے۔ عربی میں بھی اُس کا ترجمہ ہوا۔

ٹیگور[2] ہمارے ملک میں ہمارے درمیان اپنی شاعری کی بیسیوں منازل طے کرتا رہا لیکن ہم اُس کے کمالات سے ناآشنا رہے لیکن جب یورپ نے اُس کو اچھالا تو ہماری آنکھیں بھی اُس کی طرف اٹھنے لگیں اور اب صرف یورپ ہی نہیں بلکہ مشرق کی متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ یورپ نے جو اُس کی قدر کی اُس کا اندازہ اس سے نہیں

۱۔ ریاضی و نجوم کا ماہر، فارسی رباعی گو شاعر (م: مابین ۱۱۱۵ع تا ۱۱۳۵ع)۔

۲۔ بنگالی زبان کا نوبل انعام یافتہ شاعر (م ۱۹۴۱ع)۔

ہو سکتا کہ لاکھ روپے کا اعزازی انعام اُس کے لیے پیش کیا، بلکہ اس سے کہ یورپ کے دل میں ہندوستان کی وقعت کا سکہ بیٹھ گیا۔ مجھ سے ایک دوست نے بیان کیا کہ ایک ہندوستانی یورپ میں سفر کر رہا تھا۔ اُسی درجے میں سویڈن، ناروے کے دو زن و شو بھی سفر کر رہے تھے۔ جب اُن کو معلوم ہوا کہ یہ ہندوستانی ہے تو اُنھوں نے پوچھا کہ کیا تم اُس ہندوستان کے رہنے والے ہو جس نے ٹیگور کو پیدا کیا؟ اور جواب جب اثبات میں ملا تو ٹیگور کے سبب رنگ ہم وطن کے ساتھ اُن کی عقیدت اس قدر بڑھ گئی کہ وہ اپنے اس ہم سفر کو نعمت غیرمترقبہ سمجھنے لگے۔ اور دلی اضطراب کے ساتھ پوچھا کہ ہندوستان کی تعلیمی حالت کا معیار کیا ہے؟ اور جب اُنھوں نے اس کے جواب میں نو فی صدی سنا تو اُن کو کسی طرح اس کا یقین نہیں آتا تھا کہ جو ملک ٹیگور کو پیدا کر سکتا ہے وہاں صرف نو فیصدی تعلیم ہو!!

اسی 'معارف' میں پڑھ چکے ہو کہ ٹیگور کے کلام کا عربی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ سفرِ ولایت[1] سے واپسی میں چند یہودی بھی ساتھ تھے۔ میں اکثر اُن کے پاس بیٹھ کر مختلف مسائل پر باتیں کیا کرتا تھا۔ جب اُن کو معلوم ہوا کہ مجھ کو عبرانی سے بھی کچھ ذوق ہے تو عبرانی میں چھپی ہوئی ایک کتاب میرے

۱- فروری ۱۹۲۰ع میں مولانا محمد علی جوہر اور سید سلیمان ندوی نے ''مسئلۂ خلافت'' کے بارے میں یورپ کی رائے عامہ کو ترکوں کے حق میں ہموار کرنے کے لیے سفر کیا تھا۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ ''برید فرنگ'' از سید سلیمان ندوی)۔

سامنے پیش کی اور کہا کہ یہ تمھارے وطن کا تحفہ ہے۔ یہ دیکھ کر کس قدر تعجب ہوا کہ عبرانی سی مردہ زبان بھی ٹیگور کی شاعری سے زندہ کی جا رہی ہے۔ یہ عبرانی میں گارڈنر کا ترجمہ تھا۔

اقبال کی زبان غالباً بیس برس سے ہندوستان میں زمزمہ پرداز ہے۔ ہمارے نوجوانوں کے کان اُس کی سامعہ نوازی سے بہت کچھ لذت گیر ہوئے ہیں لیکن اب تک اُس کی قدر دانی کا کافی صلہ مصنف کو ہم نے ادا نہیں کیا۔ پیرس میں جب ہماری ملاقات ذکاء الملک سابق وزیر تعلیمات ایران اور علامہ عبدالوہاب قزوینی (مشہور ایرانی عالم اور صاحبِ قلم) سے ہوئی اور اُممِ اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ کا ذکر آیا تو ہم نے اقبال کے فلسفے کا ذکر کیا اور محترم محمد علی[1] نے 'رموزِ بے خودی' اور 'اسرارِ خودی' کا اپنا نسخہ اُن کے مطالعہ کو عنایت کیا۔ وہ دیکھ کر بے حد محظوظ ہوئے اور اُس وقت مجھے نظر آیا کہ اُس کی فارسی زبان نے اُس کے دائرۂ اثر کو کتنا بڑھا دیا ہے۔ اور ''معارف'' نے 'رموزِ بے خودی' پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ جو لکھا تھا کہ ''ہمارے ہندی شاعر نے فارسی زبان اس لیے اختیار کی ہے تاکہ ممالکِ اسلامیہ کا ایک بڑا طبقہ اُس سے بہرہ اندوز ہو'' وہ بالکل سچ نظر آیا۔

بہرحال اُس کی فارسی زبان کی عمومیت سے ممالکِ اسلامیہ میں اُس کے خیالات کی اشاعت کا تخیّل اب تک کماحقہ پورا نہ ہوا اور شاید

۱۔ مولانا محمد علی جوہر (م ۱۹۳۱ء)۔

اہلِ مشرق اُس کی اہمیت کو اب تک نہیں سمجھے لیکن گزشتہ دو سالوں* کی بنا پر ہم کو یقین ہے کہ اب جبکہ انگریزی قالب اُس نے اختیار کر لیا ہے تو یکایک اُس کی وقعت مشرقی غلاموں کے لیے چارچاند ہو جائے گی اور ایران و افغانستان و ترکستان کے اہلِ دماغ و اربابِ فکر اُس کی حقیقت کے طلب گار ہوں گے اور نوجوان ہندوستانی بھی اپنی قدر شناسی کے معیار کو اب اور بھی زیادہ بلند کرے گا۔

''معارف'' کے 'شذرات' میں یہ خبر درج کی جا چکی ہے کہ ''اسرارِ خودی'' کا ترجمہ چھپ کر شائع ہو گیا ہے۔ یہ ترجمہ پروفیسر نکلسن معلّمِ فارسی دارالفنون کیمبرج کے قلم سے ہوا ہے (یہ وہی پروفیسر نکلسن ہیں جو تاریخِ ادبیات عربی ــــ یعنی لٹریری ہسٹری آف عریبیا ــــ کے مصنف ہیں) میکملن اینڈ کو نے اس ترجمہ کو چھاپا ہے اور انگلستان کے مشہور کتب فروش لیوزک اینڈ کو کے ذریعے سے اس کی اشاعت ہوئی ہے اور بمبئی اور کلکتہ کے عام انگریزی کتب فروشوں سے مل سکتا ہے۔ سات شلنگ چھ پنس اس کی قیمت ہے۔

ذیل میں ہم مترجم کے مقدمے کے اقتباسات شائع کرتے ہیں جن میں اُس نے شاعر اور اُس کی شاعری پر اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں:

''اسرار خودی پہلی مرتبہ ۱۹۱۵ع بمقام لاہور شائع ہوئی۔ میں نے اُسی زمانے میں اُسے پڑھا اور اس قدر متاثر ہوا کہ اقبال کو، جن سے میری کیمبرج کی ملاقات تھی، اُس کے انگریزی ترجمے کی اجازت کے لیے لکھا۔''

''اقبال ایک ہندوستانی مسلمان ہے۔ اُس نے اپنے ممالکِ

مغرب کے قیام کے زمانے میں موجودہ فلسفے کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے اور اسی فن میں کیمبرج اور میونخ سے ڈگریاں حاصل کی ہیں۔"

"اس کا پیغام نہ صرف مسلمانانِ ہند کے لیے مخصوص ہے بلکہ وہ تمام عالمِ اسلامی کے لیے ہے۔ چنانچہ اسی مقصد کو مدِ نظر رکھ کر اُس نے اُردو کی جگہ فارسی کو ادائے مطالب کے لیے منتخب کیا ہے کیونکہ اوّل تو فارسی دنیائے اسلام میں بہت زیادہ مقبول ہے اور دوسرے فلسفیانہ خیالات جس خوبصورتی اور وضاحت سے اس زبان میں ادا ہو سکتے ہیں، کسی دوسری زبان میں ناممکن ہیں۔"

"اقبال نے ادبیاتِ یورپ کو اچھی طرح پیا ہے۔ اُس کا فلسفہ بہت کچھ نیٹشے[1] (Neitzsche) اور برگساں[2] (Burgson) کا ممنونِ احسان ہے اور اُس کی شاعری ہمارے دل میں شیلے[3] (Shelly) کی یاد تازہ کرتی ہے لیکن اس پر یہ بھی کہ اُس کا ہر خیال اور اُس کا ہر قول ایک مسلمان کا خیال اور مسلمان کا قول ہوتا ہے، اور شاید اسی وجہ

۱- جرمنی کا مشہور فلسفی (م ۱۹۰۰ء) علامہ نے اُسے "مجذوبِ فرنگی" کہا ہے۔

۲- فرانس کا مشہور فلسفی (م ۱۹۴۱ء) - ۱۹۳۳ء کے سفر یورپ میں علامہ نے اُن سے ملاقات کی تھی۔ (ملاحظہ ہو روزگارِ فقیر، حصہ اوّل، ص ۱۳۶ از فقیر سید وحید الدین) -

۳- مشہور انگریز شاعر (۱۸۲۲ء) -

سے اُس کا اثر زیادہ ہو ۔ وہ ایک پُر جوش مذہبی مسلمان ہے ۔ وہ ایک نئے مکّہ (معظمہ) کا خواب دیکھتا ہے ۔ اُسے ایک وسیع جمہوری دنیا نظر آتی ہے جس میں تمام اسلامی ریاستیں متحد و مشترک ہیں ، جس میں ملک و ملّت کی کوئی تمیز نہیں ۔ اُسے قومیت اور شہنشاہی کی ضرورت نہیں ، اُس کے خیال میں تو یہ چیزیں انسان کو ''جنت سے محروم کر دیتی ہیں'' ۔ ایک دوسرے سے نا آشنا ہو جاتا ہے ۔ برادرانہ جذبات مفقود ہو جاتے ہیں اور جنگ کا تلخ تخم بویا جاتا ہے ۔ وہ سیاست کی جگہ مذہبی حکومت کا خواب دیکھتا ہے اور میکیاولی[1] (Machiavelli) کو ، جو جھوٹے دیوتاؤں کی پرستش کرتا ہے اور جس نے بہتوں کو اندھا (گمراہ) کر رکھا ہے ، برا بھلا کہتا ہے ۔''

''یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ جب کبھی مذہب کا نام لیتا ہے تو اس سے اُس کی مراد صرف ''مذہبِ اسلام'' ہے ۔ غیر مسلم کے معنی خدا کا منکر ہے (اور ایک حد تک) اس پر جہاد کرنا لازم ہے بشرطیکہ وہ محض لوجہ اللہ ہو ۔ ایک آزاد و مخلص اسلامی برادری ، جس کا مرکز کعبہ ہو اور جو

۱۔ اٹلی کا مشہور ماہر سیاسیات ، کتاب الملوک (The Prince) کا مؤلف (م ۱۵۲۷ء) ۔ علامہ نے میکیاولی کے بارے میں کہا ہے :

آں فلارنساویٔ باطل پرست
سرمہ‌ٔ او دیدۂ مردم شکست

(اسرارِ خودی)

رشتۂ حب اللہ والرسول سے بندھی ہوئی ہو، اقبال کا نقطۂ نظر ہے۔ 'اسرار خودی' اور 'رموزِ بے خودی' میں اسی کو نہایت مؤثر خلوص کے ساتھ بیان کرتا ہے اور ہم بجز تعریف کے کچھ نہیں کر سکتے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اُس کے ذرائع حصول بھی بتاتا ہے۔ اول الذکر میں مسلم کی افرادی حیثیت سے بحث ہے اور مؤخر الذکر میں جماعتی حیثیت سے۔"

"جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ زبانِ کتاب مصنف کی مادری زبان نہیں ہے تو اُس کے کمالاتِ شاعری پر تعجب آتا ہے۔ میں نے حتی الوسع جہاں تک ہو سکا ہے، اُس کے لطف کو نثر میں قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں بعض حصے تو ایسے ہیں کہ ایک بار پڑھ لینے کے بعد اُن کو بھولنا مشکل ہے؛ مثلاً وہ حصہ جہاں وہ اُس آنے والے آدمی کا نقشہ کھینچتا ہے جس کے لیے دنیا منتظر ہے اور جو آ کر تمام عالم کو نجات دلائے گا یا مناجات جس پر کتاب ختم ہوتی ہے۔"

"جلال الدین رومی[1] کی طرح اقبال بھی اپنے مطالب کو زود فہم اور آسان بنانے کے لیے جابجا حکایات و امثال سے کام لیتا ہے کیونکہ اس کے سوا کوئی دوسری بہتر صورت نہیں ہے۔"

۱۔ صاحبِ مثنوی (م ۱۲۷۳ء)۔

''پہلے پہل جب 'اسرارِ خودی' عالمِ وجود میں آئی تو اس نے ہندی نوجوانوں کو محوِ حیرت کر دیا ۔ ان میں سے ایک لکھتا ہے : ''اقبال کا وجود ایک مسیحا سے کم نہیں کہ اُس نے ہماری مردہ لاش میں جان ڈال کر اُسے متحرک کر دیا ہے ۔'' اب یہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ یہ بیدار جماعت کس طرف کا رخ کرتی ہے ۔ کیا یہ لوگ ایک دور دراز ''مدینۃ اللہ'' کا خواب دیکھ کر مطمئن ہو جائیں گے یا ان اصولوں کو وہ اُس کے مصنف کے خیال کے برخلاف کسی دوسری غرض کے حصول کے لیے استعمال کریں گے ؟ باوجودیکہ وہ واضح طور سے علانیہ قومیت پرستی (نیشنلزم) کی مذمت کرتا ہے ، تاہم اُس کے معتقدین کا خیال ہے کہ اس سے اُس کی دوسری مراد ہے ۔''

''میں ابھی یہ پیش گوئی کرنا نہیں چاہتا کہ اس کتاب کا کیا اثر ہو گا ۔ اُس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اس زمانے کا آدمی نہیں ۔ وہ قبل از وقت پیدا ہوا اور وہ اس زمانے کے لائق نہیں ۔ ہم اُس کے خیال کو اس کے مذہب کے کسی فرقے کے نقطۂ نظر کے مطابق نہیں پاتے ۔ اس سے اسلامی دماغ میں بڑی تبدیلی ممکن ہے لیکن اس کی اہمیت ہمیں اس واقعے سے نہ سمجھنا چاہیے کہ ایک محدود عرصے میں ایسا انقلاب بھی ہو سکتا ہے ۔''

افسوس ہے کہ مترجم نے نظم کا ترجمہ نثر میں کیا ہے۔
اس سے ڈر ہے کہ شاعری کی لطافت دور ہو کر یہ مثنوی دوسری
زبانوں میں فلسفے کی کوئی بوجھل کتاب نہ بن جائے۔

☆ ☆ ☆

۲

رموزِ بے خودی

مدت سے ارادہ تھا کہ جناب ڈاکٹر محمد اقبال کی شاعری پر ایک انتقادی نظر ڈالی جائے لیکن کثرتِ مشاغل اور قلّتِ فرصت نے موقع نہ دیا ۔ ابھی اُن کی ایک مثنوی "رموزِ بے خودی" موصول ہوئی ہے ۔اس تقریب سے اب خیالات کے عرض کا کسی قدر موقع مل گیا ہے ۔

جہاں تک مجھے یاد آتا ہے ، ڈاکٹر اقبال کی شاعری کا پبلک آغاز "مخزن" لاہور کے ساتھ ساتھ ہوا ۔ یہ رسالہ ۱۹۰۲ع یا ۱۹۰۳ع کے قریب قریب نکلنا شروع ہوا تھا ۔[۱] اس لحاظ سے ڈاکٹر اقبال کی پبلک شاعری کی عمر تقریباً ۱۶ برس ہے اور اس عرصے میں اُن کی متعدد چھوٹی بڑی نظمیں شائع ہوئیں جن میں سے اکثر کی اہلِ معنی نے داد دی اور بعض پر اہلِ ظاہر نے گرفت کی ۔

ابتدا سے ڈاکٹر اقبال کی زبان اشکال پسند اور ترکیب آفرین واقع ہوئی ہے ۔ کبھی کبھی سہل پسندی کے ثبوت کے لیے اُنھوں نے نہایت رواں اور آسان زبان میں بھی نظمیں لکھیں ، لیکن پھر وہ

۱- 'مخزن' (لاہور) کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۰۱ع کو شائع ہوا ۔

ڈاکٹر اقبال کے اشعار نہ رہے بلکہ اُن کی حیثیت ایک عام اُردو شاعر کے خیالاتِ موزوں کی رہ گئی ۔[1]

کائنات کے اسرار و حقائق کی تعلیم و تلقین کے لیے ہمیشہ سے چار راستے رہے ہیں : مذہب ، فلسفہ ، تصوف اور شاعری ـــــ مذہب کی اصلی حیثیت ایک قانون اور فرمانِ شاہی کی ہے ۔ اس کی پیروی اس لیے چاہیے کہ یہ خداوندِ عالم کا حکم اور فرمان ہے اور بندوں کو اس کی تسلیم سے چارہ نہیں ۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ مصلحت اور حکمت پر بھی مبنی ہے ۔ فلسفہ اپنی بنیاد دلائل اور براہین پر قائم کرتا ہے اور وہ انسان کی عقل اور دماغ کو مخاطب کرنا چاہتا ہے ۔ تصوف انسان کے ذوقِ باطن اور لذتِ وجدانی کو اپنا رہبر بناتا ہے اور شاعری مخاطب کے انسانی ، قومی ، اخلاقی اور مذہبی جذبات کے سہارے کھڑی ہوتی ہے ۔

سچ بولنا انسانیت کا اصلی جوہر ہے لیکن یہ کہنا کہ سچ بولو کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ ہمیشہ سچ بولا کرو ، یہ مذہب کی زبان ہے ۔ سچ بولو ، کیونکہ سچائی سے انسان کی عزت برقرار اور جماعت پر اس کا اعتماد قائم ہوتا ہے ، فلسفے کی بولی ہے ۔ اور سچ بولو کہ سچائی سے دل میں ایک خاص قسم کی لذتِ نورانی حاصل ہوتی ہے ، تصوف کی تعلیم ہے ۔ اور سچ بولا کرو کہ تم اس قوم کے فرزند ہو جس نے صداقت اور راستی پر اپنی جانیں قربان کر دی ہیں ، سچ بولو کہ فطرت ہمیشہ سچ بولتی ہے ۔ پھول کی خوشبو کبھی ارادی

۱۔ یہ رائے دورِ آغاز کے کلام کے بارے میں ہے ۔

غلطی شے اپنے کو بدبو نہیں کہتی ، روشنی اپنے آپ کو کبھی تاریکی نہیں کہہ سکتی ، یہ دونوں شاعری کے محاورے ہیں ۔[1]

یہ مختلف راستے ہمیشہ سے الگ الگ تھے لیکن سب سے پہلے حضرتِ موسیٰؑ سے چند صدیوں کے بعد اسرائیلی پیغمبروں میں مذہب اور شاعری کی مخلوط راہیں نظر آتی ہیں ۔ حضرتِ داؤدؑ کی مزامیر ، حضرت سلیمانؑ کی غزلوں اور اخیر زمانے کے عبرانی پیغمبروں کے الہامی کلاموں میں ، اور سب سے زیادہ حضرت عیسیٰؑ کے مواعظ میں ، مذہب اور شاعری دوش بدوش مصروفِ کار فرمائی ہیں ۔

اسلام میں عربوں کا عنصر جب تک غالب رہا ، یہ طریقے باہم مزج نہیں ہوئے ۔ عجمیت کے اثر نے جو نتائج پیدا کیے ، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ تعلیم و تلقین کے یہ مختلف اسلوب ایک صف میں آ کر انسان کو ہر راستے سے متاثر کرنے لگے ۔ پہلے یہ تھا کہ انسان اپنے ذوق اور مناسبتِ طبع کی بنا پر اُن میں سے ایک راستے کو اپنے لیے انتخاب کر لیتا تھا لیکن عجم کے صوفیوں نے دیکھا کہ اس

۱۔ سیّد صاحب کے ایک دوست قاضی عبدالوحید صاحب نے اُن کے خیال کو اس شعر میں بیان کیا ہے :

کیا چیز ہے شعر ؟ سن لو گفتار ہے وہ
(قول)
کیا اصل ہے فلسفے کی ؟ پندار ہے وہ
(علم)
مذہب کسے کہتے ہیں ؟ تصوّف کیا ہے ؟
کردار اگر ہے یہ ، تو رفتار ہے وہ
(فعلِ قلب) (فعلِ جوارح)

طریقے سے بہت کم تعداد ہماری گرفت میں آتی ہے ۔ انھوں نے چاروں کو ملا کر ایک کردیا تاکہ ہر مخاطب انسان ان میں سے کسی ایک پر ضرور ہے کہ سر ڈال دے گا ۔

ہمارے خیال میں حکیم سنائی[1] پہلے شخص ہیں جو اس طریقۂ خاص کے موجد ہیں اور اس کے بعد مولانائے روم کے عہد میں یہ فن عروجِ کمال تک پہنچ جاتا ہے ۔ مولوی رومی نے اپنے سات دفتروں میں سات آسمانوں کے خزانے یک جا کر دیے ۔ اور چونکہ وقت کی چیز تھی اس لیے اہلِ معنی میں اس کی بے انتہا مقبولیت ہوئی اور اب بھی وہ مقبول ہے اور ایک حد تک اس نے ملک و قوم کو فائدہ پہنچایا ہے ۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ چوتھی صدی سے لے کر دسویں صدی تک شعرائے باطن نے ہم کو جو کچھ سمجھایا ، قرآن پاک اور حدیثِ قدسی کی جو کچھ تفسیریں انھوں نے کیں ، ہمارے حاکمانہ غیظ و غضب ، فاتحانہ جوش و خروش اور مجاہدانہ زور و قوت کو اعتدال پر لانے کے لیے وہ ضروری تھا ۔

لیکن اب حالت یہ ہے کہ ہمارے مشتعل قویٰ سرد ہو گئے ہیں ، ہمارے خون کی گرمی محکومانہ برودت سے بدل گئی ہے اور ہمارے قویٰ میں مفتوحانہ ضعف آ گیا ہے ۔ ایسی حالت میں اگر اسی پرانے نسخے کا استعمال جاری رہا تو بُردِ اطراف کے بعد شاید وہ بُردِ قلب کا باعث ہو جائے ، اس لیے ضرورت تھی کہ ہمارے اہلِ دل شعرا "مثنوی

۱- غزنی کے مشہور شاعر (م ۱۱۳۱ع) ۔ متعدد مثنویاں اُن سے یادگار ہیں جن میں "حدیقہ" سب سے زیادہ مشہور ہے ۔

مولویٔ روم'' کا دوسرا نسخہ ہمارے لیے تیار کردیں ۔

شعرائے حال میں ڈاکٹر اقبال کو اللہ تعالٰی نے اس ضرورت کے لیے چُن لیا ۔ اُنھوں نے اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر دو مثنویاں لکھیں : ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' ۔ پہلی مثنوی میری نظر سے نہیں گزری ، البتہ رداً اور اعتراضاً اس کے بعض بعض ٹکڑے اخبارات میں دیکھے ۔ اس سفر میں مجھے محمد علی کی زبان سے اُس کے متعدد ابواب سننے کا موقع ملا ۔ انھوں نے اس ذوق اور وجد کے ساتھ اس کے اشعار سنائے کہ میں سراپا اثر ہوگیا ۔ شاعر نے جو کچھ کہا تھا اُس کو ایک بہتر مفسّر کی زبان سے سن کر خود بخود اُس کے اسرار و حِکَم کے عقدے وا ہونے لگے ۔

اس وقت ہمارے پیشِ نظر اس مثنوی کا دوسرا حصہ ''رموزِ بے خودی'' ہے ۔ یہ مثنوی چھوٹی تقطیع کے ۱۳۹ صفحوں میں عمدہ کاغذ پر اہتمام کے ساتھ چھپی ہے ۔ زبان فارسی اختیار کی گئی ہے اور یہ شاید اس لیے تاکہ فوائد ہندوستان کی دیواروں تک محدود نہ رہیں ، بلکہ دنیا کی وہ تمام آبادی ، جس کی حیاتِ ملّی کو اس میں خطاب کیا گیا ہے ، اُس کو سمجھ سکے ۔

زبان کے لحاظ سے میں ڈاکٹر اقبال کو اُن شعرا میں گنتا ہوں جو معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے مقابلے میں الفاظ اور محاوروں کی ظاہری صحت کی پروا نہیں کرتے ، لیکن حق یہ ہے کہ اس لغزشِ مستانہ پر ہزاروں سنجیدہ اور متین رفتاریں قربان ہیں ۔ مصرعوں کے دروبست اور فصل و وصل میں قصور ممکن ہے ، لیکن یہ ناممکن ہے کہ جو مصرع ڈاکٹر اقبال کی زبان سے نکل جائے وہ تیر و نشتر

بن کر سننے والوں کے دل و جگر میں نہ اُترے۔ شاید اس کا سبب یہی ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنے مخاطب کے احساسات پر مذہب، فلسفے، تصوف اور شاعری ہر راہ سے حملہ کرتے ہیں اور اس لیے اختلافِ مذاق کے باوجود ان مختلف راہوں میں سے کسی ایک سے بھی بچ کر نکل نہیں سکتا۔

زیرِ تقریظ مثنوی میرے خیال میں زبان کے لحاظ سے ''اسرارِ خودی'' سے بہتر ہے۔[۱] اور اصل معنی کے لحاظ سے دونوں میں یہ فرق ہے کہ اس میں مظاہرِ سیاست بیشتر اور اس میں مذہب کے عناصر زیادہ ہیں لیکن منزلِ مقصود ایک ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں دوبارہ زندگی پیدا کرنے کی جو تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں، حکمائے ملّت ان میں مسلمانوں کے مزاجِ قومی کی تشخیص نہیں کرتے۔ مسلمانوں کے قومی مزاج کو جن لوگوں نے پہچانا ہے وہ صرف تین شخص ہیں: مولانا شبلی نے آخری تین سال کے کلام میں، مولانا ابوالکلام نے مجاہداتِ ''الہلال'' میں اور ڈاکٹر اقبال نے اپنی ان دو مثنویوں میں۔ اور اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ راستے اوروں پر بھی مکشوف ہو رہے ہیں۔

''رموزِ بے خودی'' ہے جس کا اصل مقصود ''ملّتِ اسلامیہ کے اسرارِ حیات کی تشریح'' ہے، حسبِ ذیل عنوانوں پر منقسم ہے — جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کی راہِ ترقی کے حسبِ ذیل منازل ہیں:

(۱) افراد اور قوم میں باہمی نسبت۔

۱- 'رموزِ بے خودی' کی زبان کے لیے مکاتیب ملاحظہ ہوں۔

(۲) قومیت کی پیدائش ، افراد کی اجتماعی کیفیت سے ہوتی ہے اور اجتماعی کیفیت صرف نبوت کے یقین سے پیدا ہوتی ہے اور یہی یقین منتشر افراد کو ایک سلسلے میں منسلک کر دیتا ہے ۔

(۳) ملّت اسلامی کے اساسی ارکان میں سے پہلا رکن توحید ہے اور توحید کے معنی ہیں ایک ذاتِ برتر کے آگے اپنے کو ہیچ اور بے مقدار جان کر تمام دنیا سے بے خوف اور نڈر ہو جانا ۔

(۴) جس طرح ایک فرد کے لیے آخری لمحۂ حیات وہ ہے جب وہ اپنے وجود سے مایوس اور ناامید ہو جائے ، اسی طرح قوموں کی زندگی کے خاتمے کا دن وہ ہے جب وہ اپنی قومی زندگی سے ناامید اور مایوس ہو جائیں ۔ مسلمانوں کی قوم میں آج جو افسردہ دلی اور موت سی نظر آتی ہے وہ اسی طرح کے حزن و ملال اور یاس کا نتیجہ ہے ۔ مسلمانوں کو یہ چیزیں اپنے دل سے صاف نکال دینی چاہئیں اور اس میں کامیابی صرف تکمیلِ ایمان سے ہو سکتی ہے ۔ قرآن مجید کی آیتِ مبارکہ "لا تقنطوا من رحمۃ اللہ"[۱] اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ اسی لیے "لا تخف ولا تحزن"[۲]

۱- زمر : ۵۳ (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو) ۔
۲- عنکبوت : ۳۳ (نہ خوف کھا اور نہ ملال کر) ۔

اور مسلمانوں کو ''لاخوف علیھم و لاھم یحزنون''
کی تعلیم دی گئی ہے ۔

(۵) ملّت کا دوسرا رکنِ اساسی اقرارِ رسالت ہے اور بغیر اس کے ، جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے ، قومیت کا شیرازہ نہیں بندھتا ۔

اس کے بعد شاعر نے نہایت عمدہ پیرایۂ قصص و حکایات میں حسبِ ذیل امور کی تشریح کی ہے :

۱- حکایتِ بو عبیدہ و جابان در معنی اخوتِ اسلامیہ ۔
۲- حکایتِ سلطان مراد و معمار در معنئ مساواتِ اسلامیہ ۔
۳- در معنئ حرّیتِ اسلامیہ و سرِّ حادثۂ کربلا ۔
۴- در معنئ اینکہ چوں ملّتِ محمدیہ مؤسس بر توحید و رسالت است ، پس نہایتِ مکانی ندارد (یعنی اس کی جغرافی تحدید نہیں ہو سکتی بلکہ تمام دنیا اس میں شامل ہو سکتی ہے) ۔
۵- در معنی اینکہ ملّتِ محمدیہ نہایتِ زمانی ہم ندارد کہ دوامِ ایں ملّتِ شریفہ موعود است (اس کے یقین سے مسلمانوں کا حزن و یاس دور ہوگا) ۔
۶- در معنی اینکہ نظامِ ملّت غیر از آئین صورت نہ بندد و آئینِ ملّت محمدیہ قرآن است ۔
۷- در معنی اینکہ پختگئ سیرتِ ملّیہ از اتباعِ آئینِ الٰہیہ است ۔

۸- در معنی اینکہ حسنِ سیرتِ ملّیہ از تأدب بآدابِ محمدیہ است ۔

۹- درمعنی اینکہ حیاتِ ملّیہ مرکز محسوس می خواھد و مرکزِ محسوسِ ملّتِ اسلامیہ بیت‌الحرام است ۔

۱۰- در معنی اینکہ جمعیّتِ حقیقی از محکم گرفتنِ نصب العینِ ملّیہ است ، و نصب العینِ اُمّتِ محمدیہ حفظ و نشرِ توحید است ۔

۱۱- در معنی اینکہ توسیعِ حیاتِ ملّیہ از تسخیرِ قوائے نظامِ عالم است ۔

۱۲- در معنی اینکہ کمالِ حیات ملّیہ این است کہ ملّت مثلِ فرد احساسِ خودی پیدا کند و تکمیلِ این احساس از ضبطِ روایاتِ ملّیہ ممکن گردد ۔

۱۳- در معنی اینکہ بقائے نوع از اُمومت است و حفظ و احترامِ اُمومت اصلِ اسلام است ۔

۱۴- در معنی اینکہ سیدة النساء فاطمة الزہراؓ اسوۂ کاملہ است برائے نساے اسلام ۔

۱۵- خلاصۂ مطالبِ مثنوی در تفسیر سورۂ اخلاص ۔

شاعر نے ان مطالبِ پانزدہ‌گانہ میں سے ہر ایک کو واقعات ، حکایات اور آیاتِ قرآن اور حدیث سے محکم کیا ہے ۔ قرآن مجید کی آیتیں نہایت خوبی سے اس انگشتری کا نگینہ بنتی چلی گئی ہیں ۔ جہاں تک ہمارے مطالعے نے کام دیا ہے ، احادیث میں دفعہ ۴ کے علاوہ اور تمام واقعات صحیح ماخذوں سے لیے گئے ہیں ۔

مثنوی کے ابتدائی ابیات ، جن کا عنوان ''پیش کش بحضورِ ملّتِ اسلامیہ'' ہے ، یہ ہیں :

اے ترا حق زبدۂ اقوام کرد
ختم بر تو دورۂ ایّام کرد

اے مثالِ انبیاء پاکانِ تو
همگرِ دلہا ، جگر چاکانِ تو

اے بعشقِ دیگراں دل باختہ
جلوہ ہائے خویش را نشناختہ

اے فلک مشتِ غبارِ کوئے تو
اے تماشا گاہِ عالم روئے تو

همچو موج آتش ِ تہ پا میروی
تو کجا بہرِ تماشا می روی

اے نظر بر حسنِ ترسا زادۂ
اے ز راہِ کعبہ دور افتادۂ

رمزِ سوز آموز از پروانۂ
در شرر تعمیر کن کاشانۂ

یہ مثنوی بھی ڈاکٹر اقبال کی دوسری نظموں کی طرح تعقیدِ لفظی اور معنوی سے 'بری نہیں'[۱] ہے - تاہم بعض مقامات پر مسلسل اشعار اس قدر رواں اور سلیس البیانی کے ساتھ مؤثر ہیں کہ بار بار

۱- ملاحظہ ہو 'مکاتیبِ اقبال بنام سید صاحب' -

ان کے پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ خوف و یاس کی برائی میں لکھتے ہیں :

از دمش میرد قوائے زندگی
خشک گردد چشمہ ہائے زندگی

خفتہ باغم در تہِ یک چادر است
غم رگِ جاں را مثالِ نشتر است

ایکہ در زندانِ غم باشی اسیر
از نبی تعلیمِ "لا تحزن" بگیر

ایں سبق ، صدیق را صدیق کرد
سرخوش از پیمانۂ تحقیق کرد

گر خدا داری ز غم آزاد شو
از خیالِ بیش و کم آزاد شو

دشمنت ترساں اگر بیند ترا
از خیابانت چو گل[1] چیند ترا

ضربِ تیغِ او قوی تر می فتد
ہم نگاہش مثلِ خنجر می فتد

بیم چوں بند است اندر پائے ما
ورنہ صد سیل است در دریائے ما

ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست
اصلِ او بیم است اگر بینی درست

۱۔ اس تشبیہ میں کم از کم مجھ کو کلام ہے (س)۔

لابہ و مکاری و کین و دروغ
این ہمہ از خوف می گیرد فروغ

پردۂ زور و ریا پیراهنش
فتنہ را آغوشِ مادر دامنش

ہر کہ رمز مصطفیٰ[1] فہمیدہ است
شرک او درخوف مضمر دیدہ است

اتباعِ شریعت کے باب میں لکھا ہے:

اے کہ باشی حکمتِ دیں را امین
با تو گویم نکتۂ شرعِ مبین

چون کسے گردد مزاحم بے سبب
با مسلماں در ادائے مستحب

مستحب را فرض گردانیدہ اند
زندگی را عینِ قدرت دیدہ اند

روزِ ہیجا لشکرِ اعدا اگر
از خیالِ صلح گردد بے خطر

گیرد آسان روزگارِ خویش را
بشکند حصن و حصارِ خویش را

سرِ این فرمانِ حق دانی کہ چیست
زیستن اندر خطرہا زندگی ست

۱- شاید یہ فارسی محاورہ ہو - (م)

شرع می خواهد کہ چوں آئی بجنگ
شعلہ گردی ، واشگافی کامِ سنگ
آزمـاید قوتِ بازوے تو
می نہد الوند پیشِ روے تو
باز گوید سرمہ ساز الوند را
از تفِ خنجر گداز الوند را
نیست میشِ ناتوانے لاغرے
درخورِ سرپنجۂ شیرِ نرے
باز چوں با صعوہ خوگر می شود
از شکارِ خود زبوں تر می شود
خستہ باشی استوارت می کند
پختہ مثلِ کوھسارت می کند
ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات
شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات
گر زمینی ، آسماں سازد ترا
آنچہ حق می خواھد آں سازد ترا
سیقلش آئینہ سازد سنگ را
از دلِ آہن رباید زنگ را

اسی طرح تمام بیان مسلسل ، بلند تر اور پُراثر ہے ۔

ڈاکٹر اقبال نے عالمگیر اور اکبر کی نسبت اپنا جو خیال

ضمناً ظاہر کیا ہے ، اب اکثر اربابِ فکر اسی نتیجے پر پہنچے ہیں :

شاہ عالمگیر گردوں آستاں
اعتبارِ دودمانِ گورگاں

پایۂ اسلامیاں برتر ازو
احترامِ شرعِ پیغمبرؐ ازو

درمیانِ کارزار کفر و دیں
ترکشِ ما را خدنگِ آخریں

تخم الحادے کہ اکبر پرورید
باز اندر فطرتِ دارا دمید

شمعِ دل در سینہ ہا روشن نبود
ملّتِ ما از فساد ایمن نبود

حق گزید از ہند عالمگیر را
آں فقیرِ صاحبِ شمشیر را

برقِ تیغش خرمنِ الحاد سوخت
شمعِ دیں در محفل ما بر فروخت

کور ذوقاں داستاں ها ساختند
وسعتِ ادراکِ او نشناختند

شعلۂ توحید را پروانہ بود
چوں براهیم[۴] اندریں بتخانہ بود

اسی طرح مثنوی کے اکثر ابواب میں مذہبی حقائق ، فلسفیانہ تشریح کے ساتھ ، صوفیانہ رنگ میں شعر بنتے چلے گئے ہیں ۔

ایک بالغ نظر شخص اس مثنوی میں الفاظ کی صحت یا صحیح

فارسی معنی میں ان کے استعمال کی صحت میں شک اور بعض فارسی محاوروں کی گرفت کر سکتا ہے ، لیکن اصل یہ ہے کہ اقبال کے شاعرانہ خیالات میں اتنی تیز روانی ہے کہ یہ خس و خاشاک اس کی خوبی و لطافت میں مزاحم نہیں ہو سکتے - اسی لیے اس تقریظ میں ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی - نکتہ چینی اور حرف گیری بہت ہو چکی ، اب کچھ سوچنا اور سمجھنا بھی چاہیے اور یہی اس مثنوی کا اہم المطالب ہے -

علاوہ ازیں ڈاکٹر اقبال نے جو اسرار و نکات اس میں حل کیے ہیں ، اُن کی بنا پر یہ مثنوی نہ صرف شاعری اور فنِ قومیات کا ایک رسالہ ہے بلکہ ہمارے خیال میں جدید علمِ کلام کی ایک بہترین کتاب ہے - توحید کا ثبوت ، رسالت کی ضرورت ، قرآن پر ایمان رکھنے کا سبب اور قبلہ کی حاجت وغیرہ اعتقادی مسائل پر نہایت پُراثر اور تشفی بخش دلائل اس کے اندر موجود ہیں -

(معارف ، اپریل ۱۹۱۸ع)

☆ ☆ ☆

۳

خضرِ راہ

ڈاکٹر اقبال نے مدت کے بعد امسال[1] انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور میں اپنی زبان کھولی اور ایک نظم موسوم بہ "خضرِ راہ" لوگوں کو پڑھ کر سنائی - یہ نظم ابھی چھپ کر شائع نہیں ہوئی تھی[2] کہ ہمارے لاہور کے ایک دوست غلام جیلانی صاحب نے اپنے وجد و شوق کے عالم میں اس نظم کی ہم سے تقریب کی اور ہمارے سامنے اس ذوق و اثر کی تصویر کھینچی جو اس نظم کے پڑھتے وقت متکلم اور مخاطب دونوں پر طاری تھا -

شاعر نے اس نظم میں خضر کو اپنا پیر و مرشد بنا کر تمام موجودہ واقعات کے متعلق اُن سے کشفِ حقائق کرائے ہیں - پہلے خضر نے خود اپنی حیاتِ جاوداں کی حقیقت ظاہر کی ، پھر 'زندگی' کیا ہے ؟ اس کی تفسیر کی ہے - سلطنت و حکومت کیا چیز ہے ؟ اور

۱- اپریل ۱۹۲۲ء -

۲- پہلی بار چھوٹی تقطیع میں منشی طاہرالدین ، انارکلی لاہور ، نے شائع کی تھی - اُسی کی طرف اشارہ ہے -

موجودہ نظام ہائے حکومت کی اصلیت کیا ہے؟ اس پر بحث کی ہے۔ اس کے بعد ''سرمایہ اور مزدور'' یا بالشوزم پر گفتگو کی ہے۔ آخر میں ''دنیائے اسلام'' کو مخاطب کیا ہے اور پیش آمدہ واقعات کو آیندہ کامیابیوں کا مقدمہ اور تمہید بتایا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کی یہ نظم گو جوشِ بیان میں ان کی پچھلی نظموں[1] سے کم ہے لیکن اسی نسبت سے تعقید اور فارسیت میں بھی کمی ہے۔ ان کی شاعری کا اصلی جوہر فلسفے اور تخیل کی مصالحانہ آمیزش ہے اور ان کی یہ خصوصیت اس نظم میں بھی نمایاں ہے۔

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے جب یہ نظم جلسے میں پڑھنا شروع کی تو مجلس پر ایک سماں بندھ گیا۔ اکثر شعروں پر سامعین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے لیکن نظم کے دو مصرعوں نے خود شاعر کی آنکھوں کو بھی اشک بار کر دیا:

(۱) بیچتا ہے ہاشمی، ناموسِ دینِ مصطفٰیؐ

(۲) ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو

ہم کو اس نظم کے جس شعر نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ یہ تھا:

لے گئے تثلیث کے فرزند، میراثِ خلیلؑ
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

۱- اس سے پہلے علامہ انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسے میں 'شکوہ' اور جنگِ بلقان کے سلسلے میں ایک جلسے میں 'جوابِ شکوہ' سنا چکے تھے۔

ڈاکٹر اقبال کی یہ نظم ایسی ہے کہ اس کی شرح لکھنا چاہیے - ذیل میں ہم اس نظم کے چند منتخب اشعار اور بند نقل کرتے ہیں - شائقین کو چاہیے کہ اصل نظم منگوا کر مطالعہ کریں -

اسی تقریب میں ہم ناظرین کو ایک اور خوش خبری سنانا چاہتے ہیں : ڈاکٹر اقبال ملک کے ان پُرشور ایام میں خاموش نہیں رہے ہیں - جرمنی کے ایک شاعر گوئٹے[1] نے اپنے جس مجموعۂ اشعار کا نام "مشرقی دیوان" رکھا ہے ، مغرب کا مشرق پر اب تک یہ قرض چلا آتا تھا - ہمارا "مشرقی شاعر" اس قرض کے بار سے مشرق کو سبک دوش کرنا چاہتا ہے - چنانچہ جیسا ڈاکٹر اقبال صاحب کے والا نامہ مرسلۂ ایڈیٹر "معارف" سے معلوم ہوا کہ اُنھوں نے گوئٹے کے جواب میں فارسی اشعار کا ایک مجموعہ لکھا ہے جو عنقریب شائع ہوگا - اس کے دیباچے میں ڈاکٹر اقبال یہ دکھائیں گے کہ فارسی لٹریچر نے جرمن لٹریچر پر کیا اثر ڈالا ہے - ابھی گزشتہ دنوں مشرقی کانفرنس کلکتہ میں ڈاکٹر جیون جی جمشید جی نے تقریباً اسی موضوع پر ایک مضمون پڑھا تھا - اُمید ہے کہ ڈاکٹر اقبال کا قلم اُن سے زیادہ سیراب کن ہوگا -

اس منشور تمہید کے ظلمات کو طے کر کے اب ناظرین خضرِ راہ کی طرف توجہ کریں -[2]

("معارف" مئی ۱۹۲۲ع)

۱- جرمن شاعر اور فلسفی (م ۱۸۳۲ع) -
۲- اس کے بعد نظم کا انتخاب درج ہے - (مرتب)

۴

پیامِ مشرق

ایک سال کا عرصہ ہوا کہ ''معارف'' نے یہ اطلاع شائع کی تھی کہ ڈاکٹر اقبال آج کل جرمن شاعر کے ''مغربی دیوان'' کے جواب میں ایک مشرقی دیوان مرتب کر رہے ہیں۔ ایک سال کے انتظار کے بعد ''ماہِ عید'' پیامِ مشرق بن کر نظر آیا۔ ''پیامِ مشرق'' مختلف اوزان و بحور میں مواعظ و حکم اور حقائق و معارف کا ایک بحرِ ذخار ہے۔ یقیناً یہ ڈاکٹر اقبال کے دماغ و قلم کا شاہکار (ماسٹر پیس) ہے اور شاید اقبال بھی اس سے بہتر کبھی نہ کہہ سکیں گے۔ کبھی موقع سے اس کے متعلق ہم اپنے مفصل خیالات پیش کریں گے۔

(''معارف''، جون ۱۹۲۳ء)

☆ ☆ ☆

۵

مثنوی مسافر

سیّد صاحب سفرِ افغانستان کی روداد لکھ کر
فارغ ہوئے تھے کہ مثنوی "مسافر" باصرہ نواز
ہوئی - چنانچہ رقم طراز ہیں - (مرتّب)

کیا عجیب اتفاق ہے - آج ۷ - اکتوبر ۱۹۳۴ع کو جب داستانِ سفر کی آخری سطر سے میں نے فراغت پائی ہے ، ڈاک کے قاصد نے سر محمد اقبال کی تالیف "مسافر" ہاتھ میں دی - یہ افغانستان کی چند روزہ سیاحت پر موصوف کے شاعرانہ جذبات کا مجموعہ ہے جو ابھی شائع ہوا ہے - یہ فارسی زبان میں خیبر و سرحد و کابل و غزنین و قندھار کے عبرت انگیز مناظر و مقابر پر شاعر کے آنسو ہیں اور بابر[1] ، سلطان محمود[2] ، حکیم سنائی[3] اور احمد شاہ

۱- برصغیر پاک و ہند کا پہلا مغل حکمران (م ۱۵۳۰ع) -
۲- فاتح سومنات (م ۱۰۳۰ع) -
۳- غزنی کا مشہور شاعر (م ۱۱۳۱ع) -

درانی[1] کی خاموش تربتوں کے زبانِ حال سے سوال و جواب ہیں ۔ ''مسافر'' کا آغاز نادر شاہ شہید کے مناقب سے اور اختتام شاہ محمد ظاہر خان سے اظہارِ توقعات پر ہے :

خطاب بہ شاہ ظاہر خان[2]

اے قبائے پادشاهی بر تو راست
سایهٔ تو خاکِ ما را کیمیاست

از تو اے سرمایهٔ فتح و ظفر
تختِ احمد شاہ را شانے دگر

حرفِ شوق آورده ام از من پذیر
از فقیرے رمزِ سلطانی بگیر

هر که خود را صاحبِ امروز کرد
گردِ او گردد سپہرِ گرد گرد
او جہانِ رنگ و بو را آبروست
دوش ازو ، امروز ازو ، فردا ازوست

۱۔ افغان حکمران جس نے پانی پت کی تیسری جنگ (۱۷۶۱ء) میں مرہٹوں کو شکست دی ۔
۲۔ سیّد صاحب نے مکمل نظم نقل کرنے کی بجائے انتخاب پر اکتفا کیا ہے ۔

مردِ حق سرمایۂ روز و شب است
زانکه او تقدیر خود را کوکب است

سرگذشتِ آلِ عثمان را نگر
از فریبِ غربیان خونیں جگر

ذکر و فکرِ نادری در خونِ تست
قاهری با دلبری در خونِ تست
اے فروغِ دیدۂ برنا و پیر
سرِ کار از هاشم و محمود گیر
هم ازاں مردے[۱] کہ اندر کوه و دشت
حق ز تیغِ او بلند آوازه گشت
روز ها ، شب ها تپیدن می‌تواں
عصرِ دیگر آفریدن می تواں
صد جهاں باقیست در قرآں هنوز
اندر آیاتش یکے خود را بسوز
باز افغاں را ازاں سوزے بده
عصرِ او را صبحِ نوروزے بده

☆ ☆ ☆

۱- والدِ حضرت شاه ولی خاں ۔

٦

بالِ جبریل

آردو کی یہ خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے "بانگِ درا" کے بعد، جو اُن کے پرانے آردو کلام کا مجموعہ ہے، اب "بالِ جبریل" کے نام سے اپنے نئے آردو کلام کا مجموعہ شائع فرمایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری کا آغاز گو آردو شاعر کی حیثیت سے کیا مگر ادھر کم از کم بیس برس سے وہ اپنے سامعین کی وسعت اور دنیائے اسلام کے ایک بڑے حصے تک اُس کو پہنچانے کی خاطر، نیز اپنے حکیمانہ اسلامی خیالات کو مناسب پیرایۂ بیاں میں ادا کرنے کے لیے فارسی میں اظہارِ خیال کرنے لگے اور مولانا رومی کی رہنمائی میں آسمانوں کی سیر فرماتے رہے۔ اب "بالِ جبریل" کی مدد سے وہ پھر زمین پر آترے ہیں مگر اس زمین پر بھی وہ آسمانوں ہی کے لیے آمادۂ پرواز ہیں۔

"بالِ جبریل" تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ١٦ نظموں کا مجموعہ ہے اور ٣٦ صفحوں میں تمام ہوا ہے۔ ان نظموں میں بندہ و خدا میں ناز و نیاز، گلہ و شکوہ اور دعا و مناجات کے مختلف

مناظر ہیں اور ہر نظم میں شاعر بندے نے طرح طرح سے خداوندِ جل و علا کی شانِ غیوری کو حرکت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ کہیں وہ روٹھا ہے، کہیں رویا ہے، کبھی سجدے میں گر پڑا ہے اور کبھی اٹھ کر تن گیا ہے اور اپنی بندگی و عبودیت پر اترا رہا ہے اور پھر فوراً ہی اپنی عاجزی و درماندگی کی ساری بساط کو اس بارگاہِ نیاز میں نذر لاتا ہے اور اس ساری گفتگوے رندانہ میں "فقیہِ شہر" کے فتووں سے وہ علانیہ بے پروا ہے۔ اس حصے کا خاتمہ اس شعر پر ہوا ہے:

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

دوسرا حصہ ۶۱ نظموں اور ۸۳ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس کی اکثر نظمیں ہندوستان سے باہر کابل، فلسطین، اسپین اور یورپ کے شہروں میں کہی گئی ہیں۔ ان میں زیادہ تر مسلمانوں کو دنیا میں اُن کا اصل مقام بتانے اور اسلام کا حقیقی پیغام پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کبھی غزنیں میں سنائی[۳] کے مزار پر، کبھی قرطبہ کی مسجد میں، کبھی فلسطین کے بیت المقدس اور کبھی یورپ کی تماشا گاہوں میں شاعر کو مسلمانوں کی ناخود شناسی پر رونا آتا ہے۔ کبھی وہ اُن کو سمجھاتا ہے، کبھی شرماتا ہے، کبھی دھمکاتا ہے، کبھی رلاتا ہے اور ہر طرح کوشش کرتا ہے کہ مسلمان اپنی حقیقت کو سمجھیں اور اسلام کا پیغام لے کر وہ پھر پہنائے ارض کے گوشے گوشے میں دوڑ جائیں۔

ان دو گزشتہ حصوں کی نظمیں عنوانات سے خالی ہیں۔

ان کی جگہیں اعداد نے لی ہیں لیکن تیسرے حصے میں ، جو صفحہ ۱۲۳ سے صفحہ ۲۲۴ تک پھیلا ہوا ہے ، مختلف عنوانات کے تحت میں بعض طویل اور اکثر مختصر منظومات ہیں - اس کا آغاز اُس دعا سے ہے جو قرطبہ کی مسجد میں بیٹھ کر لکھی گئی ہے - پھر مسجد قرطبہ کے عنوان سے چند صفحوں کا ایک ترکیب بند ہے ، پھر قید خانے میں معتمد کی فریاد ، عبدالرحمان اول کا بویا ہوا کھجور سر زمینِ اندلس میں ، ہسپانیہ ، طارق کی دعا ، لینن خدا کے حضور میں ، فرشتوں کا گیت ، فرمانِ خدا ، ذوق و شوق ، پروانہ اور جگنو ، جاوید کے نام (جاوید سلمہ اللہ ڈاکٹر صاحب کے عزیز فرزند کا نام ہے) ، گدائی ، مُلّا اور بہشت ، دین و سیاست ، الارض للہ ، ایک نوجوان کے نام ، نصیحت ، لالۂ صحرا ، ساقی نامہ ، زمانہ ، آدم کا جنّت سے رخصتانہ ، روحِ ارضی کا آدم کو استقبال ، پیری مریدی وغیرہ عنوانات سے سینکڑوں حکیمانہ و عارفانہ خیالات ہیں جنھوں نے نظم کا قالب اختیار کر لیا ہے -

''بالِ جبریل'' کی نسبت سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں شاعر نے ''بانگِ درا'' سے بڑھ کر اپنی شاعرانہ صنعت ، سلاست ، روانی ، بے تکلفی اور زبان کی صحت میں حیرت انگیز کامیابی کا ثبوت دیا ہے اور عجب نہیں کہ ''بالِ جبریل'' کو دیکھ کر لکھنؤ اور دہلی کے صنعت گر سخن ور پنجاب کے سخن دان کا لوہا مان لیں - زبان میں غزل کی سی شیرینی تو نہیں مگر قصائد کی سی جزالت اور متانت پوری طرح موجود ہے -

معنوی حیثیت سے ''بالِ جبریل'' گو ''بانگِ درا'' کی طرح جذبات

سے معمور نہیں جس کے پڑھنے سے طبیعت میں جوش و خروش اور ولولہ و آمادگی پیدا ہو ، لیکن حکمت و معرفت اور نکتہ رسی و حقیقت شناسی کے انمول موتیوں سے اُس کے دامن بھرے ہیں ۔ اُس کے پڑھنے سے جوش و ولولہ نہیں جو جوانی کا خاصہ ہے ، بلکہ اپنی حالت پر غور و فکر کا احساس پیدا ہوتا ہے جو عمر کی سنجیدگی اور طبیعت کی پختگی کا اقتضا ہے ۔ خیالات میں رفعت ، اسرارِ الٰہیات کی ترجمانی میں حکیمانہ گہرائی ، اجتماعیات میں حیاتِ اسلامی کی روح کی صحیح معرفت ، مسلمانوں کے سامنے اُن کی معیاری زندگی کی اصل تصویر کشی اور ''نوجوانانِ سعادت مند'' کے پند و نصیحت میں ''پیرِ دانا'' کی سی مشفقانہ حکمت آموزی ہے ۔

ایک نظم کا عنوان ''روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے'' ہے ۔ اس کے نیچے ذیل کی نظم ہے :

کھول آنکھ ، زمیں دیکھ ، فلک دیکھ ، فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایّامِ جدائی کے ستم دیکھ ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو ، معرکۂ بیم و رجا دیکھ

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل ، یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک ، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ ، یہ صحرا ، یہ سمندر ، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایّام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیّل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر ، اثرِ آہِ رسا دیکھ

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنّت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل ! کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ، ازل سے
محنت کش و خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ

اس نظم سے اندازہ ہوگا کہ ڈاکٹر اقبال کی شاعری نے خیالات کے علاوہ زبان کی سادگی اور سلاست میں بھی کس حد تک ترقی کی ہے ۔ ایک اور نظم کا عنوان "پیر و مرید" ہے ۔ پیر کون ؟ وہی مولانائے رومؒ اور مرید شاعر ۔ مرید سوال کرتا ہے اور پیر جواب دیتا ہے ۔ بعض جوابی شعر خود مولانا رومی کے ہیں ۔ مرید عرض

کرتا ہے :

چشمِ بینا سے ہے جاری جوئے خوں
علمِ حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

مولانا جواب میں فرماتے ہیں :

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے شود

مرید کہتا ہے :

سِرِ دیں ادراک میں آتا نہیں
کس طرح آئے قیامت کا یقیں

پیرِ روشن ضمیر جواب دیتے ہیں :

پس قیامت شو ، قیامت را بہیں
دیدنِ ہر چیز را شرط است دیں

مرید پوچھتا ہے :

کس طرح قابو میں آئے آب و گل
کس طرح بیدار ہو سینے میں دل

پیر بتاتے ہیں :

بندہ باش و بر زمیں رو چوں سمند
چوں جنازہ نے کہ بر گردوں برند

اسی طرح ایک دلچسپ مکالمہ جبریل اور ابلیس کے درمیان ہے۔
پھر آج کل کے نوجوان کے نام ایک "پیغام" ہے جس میں ایک مسلمان

نوجوان کو اُس کا حقیقی مقام بتایا گیا ہے :

ترے صوفے ہیں افرنگی ، ترے قالین ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے ، جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا ، شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں ، نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلّی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُس کو منزل اپنی آسمانوں میں
نہ ہو نومید ، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اسلام میں دین و سیاست کی آمیزش کا فلسفہ کس خوبی سے بیان کیا ہے :

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں
کہ وہ سربلندی تھی ، یہ سر بزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی
دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

عزیزی جاوید سلّمہ اللہ تعالیٰ کے نام شاعر باپ کا ایک خط ہے جس کو ہر مسلمان بیٹے کی آنکھوں سے گزر جانا چاہیے:

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہے اُمتوں کا چراغ
یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود
ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ
ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچہ کو صحبتِ زاغ
حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی رہے تری بے داغ
ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال
کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

پروانے اور جگنو کا یہ مختصر مناظرہ کتنی اخلاقی بلندی کا

آئینہ دار ہے۔ پروانہ کہتا ہے :

پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو
کیوں آتشِ بےسوز پہ مغرور ہے جگنو

جگنو کا جواب ہے :

اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں میں
دریوزہ گرِ آتشِ بیگانہ نہیں میں

اقبال کی اصلی تعلیم اور جذبات کی صحیح جلوہ نمائی حسبِ ذیل نظم میں ہے :

میرِ سپاہ ناسزا ، لشکریاں شکستہ صف
آہ وہ تیرِ نیم کش ، جس کا نہ ہو کوئی ہدف
تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج ، دیکھ چکا صدف صدف
عشق بتاں سے ہاتھ اٹھا ، اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگارِ دیر میں خونِ جگر نہ کر تلف
کھول کے کیا بیاں کروں سرِ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف ، موت حیاتِ بے شرف
صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ، ایک کلیم سر بکف
مثلِ کلیم ہو اگر ، معرکہ آزما کوئی !
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

یہ چند نظمیں نمونے کے طور پر بے انتخاب پیش کی گئی ہیں۔ اس مجموعے کی ہر نظم اسی قدر دلآویز اور نصیحت آمیز ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ہر تصنیف میں کوئی نہ کوئی خصوصیت ہے اور ''بالِ جبریل'' کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بے حد پرواز ہے۔

(معارف، جون ۱۹۳۵ء)

☆ ☆ ☆

۷

ضربِ کلیم

ہمارے حکیم شاعر ڈاکٹر محمد اقبال کا ایک نیا ادبی معجزہ "ضربِ کلیم" کے نام سے ظاہر ہوا ہے ۔ اس میں موصوف کی تازہ اُردو نظمیں ہیں جن میں اسلام کے نقطۂ نظر سے زمانۂ موجودہ کے خیالات پر تبصرہ کیا گیا ہے ۔ لیکن معلوم نہیں کہ یہ حضرتِ کلیمؑ کی وہ ضرب ہے جو بحرِ احمر پر پڑی تھی جس سے دریا پھٹ گیا تھا اور اس سے ایک قوم آزاد اور دوسری برباد ہوئی تھی ! یا یہ وہ ضرب ہے جو وادیِ تیہہ کی ایک چٹان پر پڑی تھی جس سے پانی کی بارہ دھاریں بنی اسرائیل کے پیاسوں کے لیے پھوٹ پڑی تھیں ! بہرحال ان دو میں سے جو بھی ہو وہ ہمارے لیے فالِ نیک ہی ہے ۔

حضرتِ اقبال کی شاعری ، اب شاعری کی حدود سے نکل کر حکمت کے سدرۃ المنتہٰی تک پہنچ چکی ہے اور "ان من الشعر لحکمۃ[1]" کے خلعتِ نبوی سے سرفراز ہو چکی ہے ۔ اب آن کی شاعری میں

۱۔ بلا شبہ بعض اشعار حکمت سے ہیں ۔ (بخاری)

جذبات کا سراب نہیں بلکہ عقل و حکمت کا چشمۂ حیات ہے۔ اب وہ لطف و لذت نہیں بلکہ بصیرت اور موعظت ہے۔ وہ مسلمانوں کو اب اُن کے بزرگوں کا تاریخی پیغام سنانے کے لیے نہیں بلکہ اُن کو قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ سمجھانے کے لیے ہے۔ وہ اب میدانِ جنگ کا رجز یا مسافرانِ راہ کے لیے بانگِ درا نہیں بلکہ وہ غور و فکر کے غارِ حرا سے ناموسِ اکبر کی آواز اور جبریلِ امین کا پیام ہے۔

("معارف" اکتوبر ۱۹۳۶ء)

☆ ☆ ☆

۸

ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر

۱۹۱۱ء میں پرنسپل صاحب علی گڑھ کالج کے ایما پر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب نے اس عنوان پر ایک فلسفیانہ لیکچر دیا تھا کہ مسلمانوں کی موجودہ بیداری کا اُن کے مستقبل پر کیا اثر پڑنے والا ہے، جس کے ضمن میں اُنھوں نے جماعتِ اسلامی کی ہیئتِ ترکیبی، اسلامی تمدّن کی ہم رنگی اور ایک خالص نظامِ اخلاق کی ضرورت پر بحث کی ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ مسلمانوں کی قومیت، وطنیت اور عصبیت دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے کیونکہ اس کا مرکز صرف اسلام ہے جو دوسرے مذاہب کی طرح عقلی اور نظری نہیں بلکہ عملی ہے۔ اُن کا تمدّن عالمگیر ہے اور ان چیزوں کے تراکیب و امتزاج سے جو لوگ پیدا ہوئے ہیں وہ اسلامی اخلاق کے خالص نمونے ہیں اس لیے اگر مسلمان ترقی کرنا چاہتے ہیں تو اُن کو یہی اصول پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اُس کے بعد اُنھوں نے مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی اور اقتصادی حالت سے بحث کی ہے اور اس ضمن میں ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام،

تعلیمِ نسواں ، مسلمانوں کے عام افلاس اور صنعت و حرفت اور تجارت کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت پر بہت زور دیا ہے - آخر میں دکھلایا ہے کہ اگر مسلمان صحیح معنی میں ایک متمدّن قوم بننا چاہتے ہیں تو ان کو سب سے پہلے سچا مسلمان بننا چاہیے - یہ لیکچر انگریزی زبان میں دیا گیا تھا - مولوی ظفر علی خاں[1] صاحب بی - اے ایڈیٹر ''زمیندار'' نے مذکورہ بالا نام سے اس کا اسی زمانے میں اردو میں ترجمہ کر دیا تھا -

☆ ☆ ☆

۱- علامہ کے دوست ، مدیرِ ''زمیندار'' (م ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء) -

۹

اقبال کے پیام کا متن اور شرح

علامہ اقبال کے سانحۂ ارتحال پر جامعۂ ملیّہ دہلی کے طلبہ نے اپنے میگزین ''جوہر'' کا 'اقبال نمبر' شائع کیا تھا ۔ اس خاص نمبر میں برِعظیم پاک و ہند کے مشاہیر اہلِ قلم نے حصہ لیا تھا ۔ سیّد صاحب کا حسبِ ذیل مضمون پہلی بار اسی خاص نمبر میں شائع ہوا تھا ۔
(مرتّب)

شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہو کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم ایک صوفی خاندان میں پیدا ہوئے تھے ۔ اُن کے والدِ مرحوم ایک خوش اوقات صوفیِ صافی تھے اور اُن کے یہاں آنے والے دوستوں کا مذاق بھی یہی تھا اور اسی ماحول میں اقبال کی پرورش ہوئی ۔

سفرِ کابل کی واپسی پر قندھار کا ریگستانی میدان طے ہو چکا تھا اور سندھ و بلوچستان کی پہاڑیوں پر ہماری موٹریں دوڑ رہی تھیں ۔ شام کا وقت تھا ، ہم دونوں ایک ہی موٹر میں بیٹھے تھے ۔ روحانیات پر گفتگو ہو رہی تھی ۔ اربابِ دل کا تذکرہ تھا کہ

موصوف نے بڑے تاثر کے ساتھ اپنی ابتدائی زندگی کے دو واقعے بیان کیے ۔ میرے خیال میں یہ دونوں واقعے اُن کی زندگی کے سارے کارناموں کی اصل اور بنیاد تھے ۔

فرمایا[1] جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اٹھ کر

---

۱ - ''سیرِ افغانستان'' میں سید صاحب نے یہی واقعہ ان الفاظ میں لکھا ہے :

''اثنائے گفتگو میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی طالب علمی کے عہد کے ایک قصے کے اثنا میں اپنے والدِ مرحوم کا ایک ایسا فقرہ سنایا جس نے میرے دل پر بے حد اثر کیا ۔ فرمایا کہ اپنے وطن سیالکوٹ میں صبح کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا ۔ ایک صبح کو نماز کے بعد حسبِ دستور میں تلاوت میں مصروف تھا کہ والدِ مرحوم ادھر آئے اور دریافت کیا کہ کیا کرتے ہو ؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں اس وقت تلاوت کرتا ہوں ۔ فرمایا جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ قرآن تمھارے قلب پر بھی اسی طرح اترا ہے جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے قلبِ اقدس پر نازل ہوا تھا ، تلاوت کا مزہ نہیں ۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ فرمایا کہ جب بی ۔ اے پاس کر لو گے تو بتاؤں گا ۔ کچھ دنوں کے بعد جب اُنھوں نے بی ۔ اے پاس کر لیا تو اس خوش خبری کے معاوضے میں اُس دن کی گفتگو کا حوالہ دے کر اس مقام کے حصول کی تدبیر پوچھی ۔ مرحوم نے اُن کو کچھ طریقے اور دعائیں تلقین کیں اور نوجوان بیٹے سے عہد لیا کہ وہ ہمیشہ اپنی زبان و قلم سے ملّتِ محمدی کی خدمت بجا لاتا رہے گا ۔

ڈاکٹر صاحب کی شاعری اُن کے والدِ مرحوم کی زندگی ہی میں پورا فروغ پا چکی تھی اور ایک عالم اُن کے نغمے سے سرشار

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

روزانہ قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ والد صاحب مرحوم اپنے اوراد و وظائف سے فرصت پا کر آتے اور مجھے دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح کو میرے پاس سے گزرے تو مسکرا کر فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا۔ میں نے دو چار دفعہ بتانے کا تقاضا کیا تو فرمایا "جب امتحان دے لوگے تب"۔ جب امتحان دے چکا اور لاہور سے مکان پر آیا تو فرمایا "جب پاس ہو جاؤ گے تب"۔ جب پاس ہو گیا اور پوچھا تو فرمایا "بتاؤں گا"۔ ایک صبح کو جب حسبِ دستور قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آ گئے اور فرمایا "بیٹا! کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم ہی پر اترا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔"

آہ! کیا بات کہی اور کیسی بات فرمائی۔ لوگ قرآن کو نقالی سے پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس میں خدا ان سے ہم کلام نہیں، "یا ایہا الناس!" اور "یا ایہا الذین آمنوا!" صرف تیرہ سو برس پہلے کا قصہ ہے جس سے ان کو سروکار نہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ قرآن کی تلاوت میں ان کا دل تاثر سے خالی رہتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کہتے تھے کہ ان کا یہ فقرہ میرے دل میں اتر گیا اور اس کی لذت دل میں اب تک محسوس کرتا ہوں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ومست تھا اور مسلمانوں میں وہ قیامت انگیز تاثیر پیدا کر رہا تھا۔ اور بالآخر باپ اپنے بیٹے کی اس عیسیٰ نفسی سے مسرور ہو کر اس دنیا سے سدھارا۔" (ص ۱۷۹ - ۱۸۰)

یہ تھا وہ تخم جو اقبال کے دل میں بویا گیا اور جس کی تناور شاخیں پہنائے عالم میں ان کے موزوں نالوں کی شکل میں پھیلی ہیں۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ باپ نے ایک دن بیٹے سے کہا کہ میں نے تمھارے پڑھانے لکھانے میں جو محنت کی ہے، میں تم سے اس کا معاوضہ چاہتا ہوں۔ لائق بیٹے نے بڑے شوق سے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ باپ نے کہا ''کسی موقعے سے بتاؤں گا۔'' چنانچہ انھوں نے ایک دفعہ کہا کہ ''بیٹا! میری محنت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرنا'' بات ختم ہوگئی۔ ڈاکٹر اقبال کہتے تھے کہ اس کے بعد میں نے امتحان وغیرہ دے کر اور کامیاب ہو کر لاہور میں کام شروع کیا۔ ساتھ ہی میری شاعری کا چرچا پھیلا اور نوجوانوں نے اس کو اسلام کا ترانہ بنایا۔ پھر دوسری نظمیں لکھیں اور لوگوں نے ان کو ذوق و شوق سے پڑھا اور سنا اور سامعین میں ولولہ پیدا ہونے لگا تو ان ہی دنوں میں میرے والد مرض الموت میں بیمار ہوئے۔ میں ان کو دیکھنے کو لاہور سے آیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ والد بزرگوار! آپ سے جو میں نے اسلام کی خدمت کا عہد کیا تھا، وہ پورا کیا یا نہیں؟ باپ نے بسترِ مرگ پر شہادت دی کہ جانِ من! تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا۔

کون انکار کر سکتا ہے کہ اقبال نے ساری عمر جو پیام ہم کو سنایا وہ ان ہی دونوں مثنوں کی شرح تھی۔

☆ ☆ ☆

۱۰

ڈاکٹر اقبال کا علمِ کلام

انٹر کالجئیٹ مسلم برادر ہُڈ کے زیرِ اہتام ۹ فروری ۱۹۳۸ع کو "یومِ اقبال" منایا گیا ۔ اس موقع پر سیّد سلیمان ندوی نے مندرجہ ذیل مقالہ پیش کیا ۔ "مقالاتِ یومِ اقبال" میں بطورِ مقالہ نگار ، سیّد صاحب کے ساتھ مولانا عبدالسلام ندوی کا نام بھی درج ہے ۔ (مرتّب)

[**نوٹ** : علمِ کلام اُس علم کا نام ہے جس میں اسلامی عقائد کو دلائلِ عقلیہ سے ثابت کیا جاتا ہے ۔ لیکن ایران میں جب شاعری نے بہت زیادہ ترقی کی تو وہ صرف اپنے ہی دائرے یعنی جذبات ہی میں محدود نہیں رہی بلکہ فلسفہ ، اخلاق ، تصوف اور شریعت کے بہت سے مسائل بھی اُس میں داخل ہوگئے اور ایرانی شعرا نے ان مسائل کو عقلی دلائل کے بجائے خطابی اور شاعرانہ دلائل سے اس خوبی کے ساتھ ثابت کیا کہ اُن کا طرزِ بیان ہمارے قدیم علمِ کلام کے عقلی دلائل سے زیادہ مؤثر اور دل نشیں ثابت ہوا ۔ حکیم سنائی ،

سحابی[1] ، صائب[2] ، عرفی[3] اور بہت سے صوفی شعراء کے کلام میں اس قسم کے حقائق و مسائل نہایت کثرت سے ملتے ہیں ۔ بالخصوص مولانا روم[4] نے اپنی مثنوی میں اخلاق و تصوف کے ساتھ تقریباً علمِ کلام کے تمام اہم مسائل کو نہایت دلآویز طریقے پر بیان کیا ہے ۔

اُردو شاعری کی بنیاد اگرچہ فارسی شاعری کی سطح پر رکھی گئی لیکن افسوس ہے کہ ہمارے شعرا نے فارسی شاعری کی نقل نہایت نامکمل طور پر کی اور علمِ کلام اور فلسفے کے اُن مسائل کو بہت کم ہاتھ لگایا جو ایران کے صوفی شعراء کے کلام میں بہ کثرت موجود تھے ۔ اُردو زبان کے شعرا میں اکبر[5] کو چھوڑ کر صرف ڈاکٹر اقبال ایک ایسے شخص ہیں جنھوں نے غزل و قصائد کے تنگ و تاریک کوچے سے نکل کر حقائق کے میدان میں قدم رکھا اور تصوف ، اخلاق ، فلسفہ اور اسرارِ شریعت کے بکثرت مسائل کو شاعرانہ انداز میں بیان کیا ۔ چنانچہ اس قسم کے مسائل میں سے اس وقت ہم علمِ کلام کے چند مسائل کو لے کر یہ دکھلانا

۱- ابو سعید سحابی نجفی (م ۱۳۰۱ع) - علامہ اقبال اُن کی رباعیات کو عمرخیام کی رباعیات سے کم خیال نہ کرتے تھے ۔
۲- شاہ عباس صفوی ثانی کا ملک الشعرا (م ۱۶۷۶ع) -
۳- جلال الدین عرفی شیرازی (م ۱۵۹۱ع) -
۴- صاحبِ مثنوی معنوی (م ۱۲۷۳ع) -
۵- علامہ اقبال کے معاصر اور دوست اکبر حسین اکبر الہ آبادی (م ۱۹۲۱ع) -

چاہتے ہیں کہ انھوں نے موجودہ دور کے رجحان و مذاق کے مطابق ان مسائل کی تشریح کس خوبی کے ساتھ کی ہے۔

قدیم زمانے میں جس طرح فلسفہ و سائنس کے مسائل عقلی دلائل سے ثابت کیے جاتے تھے، بعینہٖ اسی طرح ہمارے متکلمین نے اسلامی عقائد ـــــ مثلاً وجودِ باری، توحید، نبوت اور حشر و نشر وغیرہ ـــــ کا اثبات عقلی دلائل سے کیا۔ لیکن ان دلائل سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ توحید، نبوت اور رسالت وغیرہ کے عملی نتائج اس دنیا میں کیا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام غزالی[1] اور امام رازی[2] وغیرہ نے اس روش کو چھوڑ کر نظری و عملی نتائج سے نبوت اور رسالت کا اثبات کیا۔ ہمارے صوفی شعرا بالخصوص حکیم سنائی اور مولانا رومی نے شاعرانہ و خطابی دلائل سے ان مسائل کے طریقۂ اثبات کو زیادہ مؤثر، دل نشیں اور قریب الفہم بنا دیا۔ اس لیے موجودہ دور میں یہ طریقۂ اثبات کافی نہیں ہو سکتا۔ یہ زمانہ ایک نئے تمدن و تہذیب کی ترقی کا زمانہ ہے اور اس زمانے میں کسی مسئلے کی صرف نظری حیثیت پر نگاہ نہیں ڈالی جاتی بلکہ عملی حیثیت سے اُن کے نتائج و مظاہر پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ اس زمانے میں سائنس کو جو مقبولیت حاصل ہے اُس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ وہ نہایت آسانی سے ہوا کو پانی اور پانی کو ہوا بنا دیتی ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج دنیا کی تمام ترقی سائنس ہی کی بدولت

۱۔ ایک بلند پایہ مسلم فلسفی (م ۱۱۱۱ع)۔
۲۔ امام فخرالدین رازی (م ۱۲۲۲ع)۔

چل رہی ہے ۔ ڈاکٹر اقبال کی شاعری نے اسی تمدّن ، اسی تہذیب اور اسی فضا میں بال و پر کھولے ہیں ، اس لیے اُنھوں نے اسلامی عقائد کا اثبات زیادہ تر اُن کے عملی نتائج سے کیا ہے اور خودی کا جو فلسفہ اُن کا مخصوص فلسفہ ہے ، اُس سے اُنھوں نے ان مسائل کی تشریح و اثبات میں بھی کام لیا ہے ۔ اس لیے اُن کا طرزِ بیان قدیم علمائے کلام اور قدیم متکلّم صوفی شعرا کے اندازِ بیان سے زیادہ اس زمانے کے رجحان و مذاق کے مطابق ہے اور ہم اسی رجحان و مذاق کے مطابق اُن کے علمِ کلام پر بحث کرنا چاہتے ہیں] ۔

توحیدِ باری :

نظری حیثیت سے توحیدِ باری کا مفہوم اس سے زیادہ نہیں کہ صرف ایک خدا کے وجود پر اعتقاد رکھا جائے لیکن عملی حیثیت سے جب تک توحید کے ماننے والوں میں عملی اتحاد نہ ہو ، محض یہ اعتقاد ناکافی ہے اور اس سے کوئی متحدہ تہذیب ، متحدہ تمدّن ، متحدہ معاشرت اور متحدہ نظامِ اخلاق نہیں پیدا ہو سکتا ۔ اگر تمام مسلمانوں کا طریقۂ نماز متحد نہ ہو اور سب کے سب اپنا قبلہ الگ الگ بنا لیں تو مسلمانوں میں یہ وحدت و یک رنگی نہیں پیدا ہو سکتی ۔ جن یونانی حکما نے وحدت الوجود کا مسئلہ ایجاد کیا تھا ، اُن کا مقصد بھی یہی تھا کہ تمام دنیا متحد ہو جائے اور ہر قسم کے اختلافات مٹ جائیں ۔ اسلامی توحید کا مقصد بھی اس قسم کی یک رنگی کا پیدا کرنا تھا ۔ لیکن زمانۂ مابعد میں اگرچہ تمام اسلامی فرقے اجمالاً عقیدۂ توحید پر متفق رہے ، تاہم فقہی اختلافات

نے اُن کے اعمال میں ناہمواری پیدا کر دی ۔ اس لیے مسلمانوں میں وہ اتحادِ عمل باقی نہیں رہا جو دورِ صحابہ میں موجود تھا ۔ اس لیے اگر محض اتحادِ عمل کو توحید کا حقیقی مظہر قرار دیا جائے تو صحابہ کی توحید موجودہ دور کے حنفیوں ، شافعیوں ، مالکیوں اور حنبلیوں سے زیادہ مکمّل و مستحکم ثابت ہوگی ۔ ڈاکٹر اقبال نے توحیدِ باری کی بنیاد اسی عملی اتحاد پر رکھی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے توحید پر جو غیر معمولی زور دیا ہے ، اُس کا مقصد مسلمانوں میں صرف اتحادِ عمل پیدا کرنا تھا ۔ اگر آج مسلمانوں میں اتحادِ عمل نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اُن میں توحید یا کم از کم کامل توحید کے ماننے والے نہیں ہیں اور اسی حیثیت سے اُنھوں نے توحید کے متعلق فقہا و متکلّمین دونوں پر اعتراض کیا ہے :

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے ؟ فقط اک مسئلۂ علمِ کلام
روشن اس ضَو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
مَیں نے اے میرِ سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام
آہ ! اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہ
وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام

15256

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام[1]

ان اشعار سے معلوم ہوا کہ توحید، وحدتِ افکار اور وحدتِ کردار کے مجموعے کا نام ہے۔ مکّی زندگی میں رسول اللہ ﷺ نے توحید کی جو تعلیم دی، اس کا تعلق صرف وحدتِ افکار سے تھا لیکن اس تعلیم نے جب ایک چھوٹی سی متحد الخیال جماعت پیدا کر دی تو آپ نے مدینے کی طرف ہجرت کی اور یہیں فرائض و احکام کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں اور وحدتِ کردار کا دور شروع ہوا۔ اور اسی وحدتِ کردار سے مسلمانوں کی عملی زندگی شروع ہوئی اور انھوں نے مشرکانِ عرب، نصارائے روم اور یہودیانِ خیبر کی طاقت کو پاش پاش کر کے اپنا ایک متحدہ نظامِ سلطنت قائم کر لیا اور ایک زندہ قوم بن گئے۔ اس لیے ڈاکٹر اقبال کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علمِ کلام

اسلام کی یہ توحید درحقیقت ایک جذباتی چیز تھی اور دنیا کی کل جذبات ہی سے چلتی ہے، لیکن متکلمین و فقہا نے اس کو محض ایک عقلی چیز بنا دیا اس لیے اس سے قدرتی طور پر انحطاط کا دور شروع ہو گیا۔ اسی نکتے کو ڈاکٹر اقبال نے ”پیامِ مشرق“ میں

۱۔ ضربِ کلیم، ص ۲۵ ۔

اس طرح بیان کیا ہے :

ہمائے علم تا افتد بدست
یقیں کم کن ، گرفتار شکے باش

عمل خواہی ؟ یقین را پختہ تر کن
یکے جوے و یکے بین و یکے باش

خدا کسی جہت میں نہیں :

علمِ کلام کا یہ ایک متداول مسئلہ ہے اور معتزلہ[1] و اشاعرہ[2] دونوں اس پر متفق ہیں کہ خداوند تعالیٰ چوں کہ مادی کثافتوں سے پاک ہے اس لیے ذوجہت اور ذو اشارہ نہیں ہو سکتا ۔ اس کا نہ کوئی حیّز ہے نہ مکان بلکہ وہ زمان و مکان کی قید سے بالکل آزاد ہے ۔ لیکن علمِ کلام میں یہ مسئلہ بالکل خشک اور بے اثر طریقے پر بیان کیا گیا ہے جس سے انسان کی بلند ہمتی اور

۱۔ متکلمین کا وہ مکتبِ فکر جو وحی اور عقل دونوں کو علم کا مأخذ و معیار خیال کرتا ہے ۔ اس کے نقطۂ نگاہ کے مطابق وحی اور عقل کو ہم آہنگ ہونا چاہیے ۔ اگر ان میں کوئی تناقض و تضاد پایا جائے تو وحی کو عقل سے جانچا جانا چاہیے ۔ اس مکتبِ فکر کے ممتاز فلاسفہ واصل بن عطا (م ۷۴۸ء) ، نظام (م ۸۴۵ء) ، جاحظ (م ۸۶۸ء) اور اخوان الصفاء (دسویں صدی کا درمیانی عرصہ) ہیں ۔

۲۔ متکلمین کا وہ مکتبِ فکر جو الاشعری (م ۹۳۶ء) کی طرف منسوب ہے ۔ یہ مکتبِ فکر وحی یا الہام ہی کو علم کا واحد مصدر سمجھتا ہے : یعنی عقل کو وحی کے آگے سرنگوں ہونا چاہیے ۔ ابوبکر باقلانی (م ۱۰۳۵ء) ، شہرستانی (م ۱۱۹۰ء) ، رازی (م ۱۲۲۲ء) اور غزالی (م ۱۱۱۱ء) اس مکتبِ فکر کے نامور مفکر ہیں ۔

جوشِ عمل کا اظہار بالکل نہیں ہوتا ۔ لیکن ڈاکٹر اقبال نے اس خشک مسئلے کو اپنے شاعرانہ زورِ بیان سے ایک نہایت پُرجوش عملی مسئلہ بنا دیا ۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا و آخرت میں جو کچھ ہے وہ تو انسان کے زورِ بازو کا نتیجہ ہے اس لیے جس طاقت نے انسان جیسی پُرزور طاقت پیدا کی ہے ، اُس کا مرتبہ تو اُس سے کہیں بالاتر ہوگا :

این چیست ؟ صنم خانۂ پندارِ من است
جلوۂ او گروِ دیدۂ بیدارِ من است
ہمہ آفاق کہ گیرم بہ نگاھے او را
حلقۂ ھست کہ از گردشِ پرکار من است
ھستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من
چہ زمان و چہ مکاں شوخیِ افکارِ من است
از فسوں کاریٔ دل ، سیر و سکوں، غیب و حضور
این کہ غمّاز و کشایندۂ اسرار من است
آں جہانے کہ درو کاشتہ را مے دروند
نور و نارش ھمہ از سبحہ و زنّارِ من است
سازِ تقدیرم و صد نغمۂ پنہاں دارم
ھر کجا زخمۂ اندیشہ رسد ، تارِ من است
اے من از فیضِ تو پایندہ ، نشانِ تو کجا است ؟
این دو گیتی اثرِ ماست ، جہانِ تو کجا است[1]

۱- زبورِ عجم ، ص ۱۷ -

عدمِ رؤیتِ باری :

اشاعرہ رؤیتِ باری کے قائل اور معتزلہ اس کے منکر ہیں لیکن دونوں کا طرزِ استدلال بالکل عقلی ہے جس سے جذبے اور قوتِ عمل کو کوئی تحریک نہیں ہوتی ۔ ڈاکٹر اقبال نے اس مسئلے میں معتزلہ کا عقیدہ اختیار کیا ہے ، لیکن یہاں بھی انھوں نے انسان کے شرف اور اس کی قوتِ عمل کے مظاہر کو نظر انداز نہیں کیا ہے ۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کے سپید و سیاہ ، دریا و کوہ ، دشت و در اور مہر و ماہ سب انسان نے پیدا کیے ہیں ، یا یہ کہ وہ انسان کے لیے پیدا کیے گئے ہیں ، اس لیے وہ ان ہی چیزوں کا گرویدہ و شیدائی ہے ۔ لیکن بلند ہمتی کا اقتضا یہ ہے کہ نگاہ کو اس سے بھی زیادہ بلند کیا جائے اور اس ذات کی تلاش کی جائے جو نگاہ کی گرفت ہی میں نہیں آ سکتی :

نورِ تو وانمود سپید و سیاہ را
دریا و کوہ و دشت و در و مہر و ماہ را

تو در ہوائے آنکہ نگہ آشنائے اوست
من در تلاشِ آں کہ نتابد نگاہ را[1]

نبوّت :

علمِ کلام میں نبوّت کا اثبات عام طور پر معجزات کے ذریعے سے کیا گیا ہے لیکن چونکہ عقلی حیثیت سے یہ طریقہ شکوک و

۱- زبورِ عجم ، ص ۴۴ -

شبہات سے خالی نہ تھا اس لیے امام غزالی ، امام رازی اور مولانا روم وغیرہ نے پیغمبروں کی تعلیمات اور اُن تعلیمات کے بہترین نتائجُ یعنی تزکیۂ نفس اور تہذیبِ اخلاق وغیرہ کے ذریعے سے اس کا اثبات کیا ۔ لیکن ڈاکٹر اقبال نے نبوت کے اثبات کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ اُن سب سے الگ اور موجودہ دور کے ذوق و رجحان کے بالکل مطابق ہے ۔ نبوت کے اثبات کا جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے اُس کی بنیاد یہ ہے کہ نبوت ایک غیر معمولی چیز ہے اس لیے اس کی وجہِ ثبوت کو بھی غیر معمولی ہونا چاہیے ، اور معجزہ چونکہ ایک مافوق الفطرت اور غیر معمولی چیز ہے اِس لیے اشاعرہ نے اسی کو نبوت کی دلیل قرار دیا ۔ لیکن اس دلیل پر جب بہت سے عقلی اعتراضات ہوئے تو امام غزالی وغیرہ نے پیغمبروں کی تعلیمات اور ان کے نتائجُ کو نبوت کا معجزہ قرار دیا ، کیونکہ جادوگروں اور شعبدہ بازوں سے بھی اگرچہ بہت سے غیر معمولی اور ما فوق الفطرت واقعات سرزد ہو سکتے ہیں لیکن جہاں تک تجربے کا تعلق ہے وہ خود نہ پیغمبروں کی طرح پاکیزہ اخلاق ہو سکتے ہیں ، نہ اعلیٰ درجے کی اخلاقی اور عملی تعلیم دے سکتے ہیں ۔ لیکن ڈاکٹر اقبال کے نزدیک ایک قوم کا پیدا کرنا نبوت کا سب سے بڑا معجزہ ہے ۔ بالخصوص اس زمانے کے قومی ہنگامۂ رستخیز میں نبوت کے ثبوت میں اسی معجزے کو پیش کیا جا سکتا ہے ۔ ساحروں اور شعبدہ بازوں سے اگرچہ بہت سے حیرت انگیز واقعات سرزد ہو سکتے ہیں لیکن آج تک کسی ساحر اور شعبدہ باز نے کسی زندہ قوم کو نہیں پیدا کیا ۔ فرعون کے جادوگروں نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے

معجزات کا مقابلہ تو ضرور کیا لیکن وہ یہودیوں جیسی قوم نہ پیدا کر سکے:

گفتم از پیغمبری هم باز گوے
سرِّ او با مردِ محرم باز گوے

گفت اقوام و ملل آیاتِ اوست
عصر هائے ما ز مخلوقاتِ اوست

از دمِ او ناطق آمد سنگ و خشت
ما همه مانندِ حاصل ، او چو کشت

هائے و هوئے اندرونِ کائنات
از لب او نجم و نور و نازعات[1]

صوفیوں نے خلوت گزینی ، ترکِ دنیا اور زہد و قناعت اور اسی قسم کے دوسرے محاسنِ اخلاق پر قناعت کر لی لیکن پیغمبروں نے اس قسم کے محاسنِ اخلاق اختیار کرکے ایک زندہ قوم اور ایک نیا عالم پیدا کر دیا ، اس لیے زہد و تقشف اور رسالت و نبوت میں زمین و آسمان کا فرق ہے:

از وجودش اعتبارِ ممکنات
اعتدالِ او عیارِ ممکنات

من چه گویم از یمِ بے ساحلش
غرق اعصار و دهور اندر دلش

۱- جاوید نامہ ، ص ۴۴ -

آنچہ در آدم بگنجد عالم است
آنچہ در عالم نگنجد آدم است

آشکارا مہر و مہ از جلوتش
نیست رہ جبریل را در خلوتش

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید
مدتے جز خویشتن کس را ندید

نقشِ ما را در دلِ او ریختند
ملتے از خلوتش انگیختند[1]

مظاہرِ عالم مثلاً آفتاب و ماہتاب اور کوہ و دشت وغیرہ سے خدا کے وجود اور قدرت پر جو استدلال کیا جاتا ہے، ایک مادہ پرست اس کا انکار کر سکتا ہے اور ان کو قوانینِ فطرت کا نتیجہ قرار دے سکتا ہے لیکن قوموں کی تولید و نشوونما بہرحال قوانینِ فطرت کا نتیجہ نہیں، بلکہ وہ انبیا کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے، اس لیے خدا کے وجود کا تو انکار کیا جا سکتا ہے لیکن نبوت کا انکار نہیں کیا جا سکتا:

میتوانی منکرِ یزداں شدن
منکر از شانِ نبی نتواں شدن[2]

۱- جاوید نامہ، صفحات ۶۸، ۷۰-
۲- جاوید نامہ، ص ۷۰-

ہجرت :

اسی سلسلے میں ڈاکٹر اقبال نے اُس مشہور اعتراض کا جواب دیا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی ہجرت پر کیا جاتا ہے ۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت دشمنوں سے ایک فرار کی صورت تھی اور اس قسم کی بزدلی ایک اولوالعزم پیغمبر کی شایانِ شان نہیں ۔ علامہ ابنِ قیّم[1] نے لکھا ہے کہ یہ بزدلی نہیں بلکہ جرأت و ہمّت تھی اور ہجرت جہاد کا مقدمہ و اعلان تھی ۔ لیکن ڈاکٹر اقبال کہتے ہیں کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ کا مقصد ایک ایسی عالمگیر ملّت کا پیدا کرنا تھا جو وطنیت کی قید سے آزاد ہو اس لیے آپ نے مکّہ سے نکل کر مدینہ میں اسی قسم کی قوم پیدا کی اور وطنیت کا خاتمہ کر دیا :

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست
رومی و شامی گلِ اندامِ ماست

قلبِ ما از ہندوروم و شام نیست
مرز و بومِ او بجز اسلام نیست

عقدۂ قومیّتِ مسلم کشود
از وطن آقائے ما ھجرت نمود

حکمتش یک ملّتِ گیتی نورد
بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد

۱- (م ۱۳۵۰ء) ، علامہ ابنِ تیمیہؒ کے شاگردِ نامور ۔

پس چرا از مسکنِ آبا گریخت ؟
تو گماں داری کہ از اعدا گریخت؟

قصہ گویاں حق ز ما پوشیدہ اند
معنیِ ہجرت غلط فہمیدہ اند

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است
ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

معنیِ او از تنک آبی رم است
ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است

بگذر از گل گلستاں مقصود تست
ایں زیاں پیرایہ بندِ سود تست[1]

معراج :

معراج کے جسمانی اور روحانی ہونے کی بحث نہایت فرسودہ و پامال ہے اور ڈاکٹر اقبال اس فرسودہ و پامال بحث میں پڑنا نہیں چاہتے - تاہم اُن کے نزدیک دنیا کے تمام واقعات صرف مادی علل و اسباب کے پابند نہیں ہیں بلکہ روحانی طاقت بڑی بہت سے واقعات کا مسبب بن سکتی ہے - اور معراج خواہ جسمانی ہو یا روحانی لیکن وہ بہرحال ایک روحانی طاقت کا نتیجہ تھی اس لیے بذات خود وہ ایک روحانی چیز تھی اور جسمانی حالت میں بھی روحانی طاقت اُس کی

۱- اسرار و رموز ، صفحات ۱۱۲ ، ۱۱۳ -

محرک تھی :

دیے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز
کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو ناراج

مشکل نہیں یارانِ چمن ، معرکۂ باز
پر سوز اگر ہو نفسِ سینۂ دراج

ناوک ہے مسلماں ، ہدف اس کا ہے ثریا
ہے سرِ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج

تو معنیِ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج[1]

علم کلام میں یہ ایک خشک اور بے اثر مسئلہ تھا لیکن ڈاکٹر اقبال نے اس کے ذریعے سے مسلمانوں کو روحانی طاقت کی نشو و نما اور بلند ہمتی کا سبق دیا ہے ۔

وحی و الہام :

ڈاکٹر اقبال کے نزدیک برے بھلے کی تمیز صرف عقل سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیے وحی و الہام کی ضرورت ہے ۔ لیکن جس طرح انسان قوتِ ذائقہ سے لذیذ و غیر لذیذ کھانے کا اور قوتِ لامسہ کے ذریعے سے نرم و سخت جسم کا احساس کر سکتا ہے بعینہ اسی طرح انسان کے اندر ایک قوت ہے جو اچھے اور برے کاموں کی تمیز کر سکتی ہے ۔ فرق صرف یہ ہے کہ اور قوتیں صرف مادیات سے تعلق

۱- ضربِ کلیم ، ص ۱۷ -

رکھتی ہیں اور یہ قوت روحانیات سے تعلق رکھتی ہے - لیکن بہرحال زندگی کی نشو و نما کے لیے یہ قوت خود زندگی ہی کے اندر موجود ہے :

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات
فکر بے نور ترا ، جذبِ عمل بے بنیاد
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات
خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیونکر
گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات[1]

جس طرح ذوقی چیزوں کی تمیز میں عقل بالکل بے کار ہو جاتی ہے ـــــ صاف و شفاف پانی کو دیکھ کر صرف عقل یہ فیصلہ نہیں کر سکتی کہ وہ شور ہے یا شیریں ، اس کا فیصلہ صرف ذوق کر سکتا ہے ـــــ اسی طرح بہت سے افعال کے حسن و قبح کا فیصلہ بھی عقل نہیں کر سکتی بلکہ خود زندگی ہی یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ کون سے افعال زندگی کے لیے موزوں ہیں اور کون سے غیر موزوں ؟ اسی ذوقی احساس کا نام وحی یا الہام ہے - باقی رہا وحی و الہام کی حالت میں آواز کا آنا ، فرشتے کی شکل کا نظر آنا ، ڈاکٹر اقبال اس کے نہ منکر ہیں نہ مُقر - ممکن ہے کہ جس طرح بھوک ، پیاس اور دوسرے جسمانی احساسات میں انسان پر خاص خاص حالات طاری ہوتے ہیں اسی طرح روحانی احساسات میں بھی انسان پر مختلف کیفیتیں طاری ہوتی ہوں -

---

۱- ایضاً ، ص ۳۸ -

مسئلۂ خیر و شر :

مذہب و اخلاق ، وحی و الہام ، امر و نہی اور عذاب و ثواب سب کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ دنیا میں برائیاں اور بھلائیاں دونوں موجود ہیں ۔ اگر یہ دونوں چیزیں موجود نہ ہوتیں تو مذہب و اخلاق کی کوئی ضرورت نہ ہوتی ۔ خیر و شر کی یہ آمیزش سب سے زیادہ انسانی فطرت میں پائی جاتی ہے ، اسی لیے وہ مذہب کا اصلی مخاطب اور مکلّف ہے ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خدا نے انسان کی فطرت ہی ایسی کیوں بنائی جس سے برائی سرزد ہو ۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ انسان فطرۃً ایسا بنایا جاتا جس سے برائی سرزد ہی نہ ہوتی ؟ متکلمین نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ انسان کی اصل فطرت میں اگرچہ برائی کا مادہ بھی موجود ہے ، تاہم اس میں نیکی کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے ، اور انصاف و حکمت کا اقتضا یہی ہے ۔ لیکن ڈاکٹر اقبال کے نزدیک نیکی و بدی دونوں میں توازن پایا جاتا ہے اور انسان میں دونوں کی مقدار برابر برابر موجود ہے اور دنیا کی رونق ، دنیا کا ہنگامہ اور دنیا کی شان و شوکت اسی توازن سے قائم ہیں ۔ چنانچہ انھوں نے خدا اور انسان کے درمیان ایک مکالمہ لکھا ہے جس میں خدا نے انسان پر صرف برائی کا الزام لگایا ہے :

جہاں را ز یک آب و گِل آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم
تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی

تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را[1]

لیکن انسان نے اس کے جواب میں ان برائیوں کا انکار نہیں کیا ہے بلکہ ان کے مقابل میں اپنی بھلائیاں گنائی ہیں :

تو شب آفریدی ، چراغ آفریدم
سفال آفریدی ، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم[2]

انھوں نے "زبورِ عجم" میں اس توازن کو اور بھی زیادہ نمایاں کیا ہے :

دلِ بے قید من با نورِ ایماں کافری کردہ
حرم را سجدہ آوردہ ، بتاں را چاکری کردہ
متاعِ طاعتِ خود را ترازوے برافرازد
ببازارِ قیامت با خدا سوداگری کردہ
زمین و آسماں را بر مرادِ خویش میخواھد
غبارِ راہ و باتقدیرِ یزداں داوری کردہ
گہے باحق در آمیزد ، گہے با حق درآویزد
زمانے حیدری کردہ ، زمانے خیبری کردہ

۱- پیامِ مشرق ، ص ۱۱۴ - ۲- ایضاً ، ص ۱۱۴ -

لیکن اسی کے ساتھ اس سے انسان کے شرف کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا : ؎

بایں بیرنگیِ جوہر ازو نیرنگ میریزد
کلیمے بیں کہ ہم پیغمبری ہم ساحری کردہ

کیونکہ باوجود خیر و شر کے اس مساویانہ امتزاج کے ، خیر کے نتائج زیادہ واضح و نمایاں ہوتے ہیں ۔ انسان میں پیغمبرانہ اور ساحرانہ قوتیں اگرچہ مساوی مقدار میں ہیں لیکن پیغمبرانہ طاقت کے جو نتائج ہیں اُن کے سامنے ساحرانہ طاقت کے نتائج بالکل ہیچ ہیں یا کم از کم یہ کہ قوتِ شر سے جو نتائجِ بد پیدا ہوتے ہیں ، انسان قوتِ خیر سے اُن کی تلافی کر دیتا ہے :

نگاہش عقل دور اندیش را ذوق جنوں دادہ
ولیکن با جنونِ فتنہ ساماں نشتری کردہ

قرآن مجید سے بھی خیر و شر کا یہی توازن ثابت ہوتا ہے ۔ فرشتوں نے حضرت آدمؑ کی خلافت پر صرف قوتِ شر کی وجہ سے اعتراض کیا تھا :

"قالوا أتجعل فیها من یفسد فیها و یسفک الدماء[1]"

(تو فرشتے) بولے کیا تو زمین میں ایسے شخص (کو نائب) بناتا ہے جو اس میں فساد پھیلائے اور خون ریزیاں کرے ؟

لیکن خدا نے نہ اس قوت کا انکار کیا اور نہ یہ بتایا کہ انسان میں قوتِ خیر قوتِ شر پر غالب ہے بلکہ اس کے مقابل میں صرف اُس

۱۔ البقرہ ، ۳۰ ۔

کی بھلائی کا پہلو رکھ دیا :

''و علّم آدم الاسماء کلّھا ثم عرضھم علی الملائکۃ فقال أنبؤنی باسماء ھولاء ان کنتم صادقین[1] ۔''

اور آدم کو سب (چیزوں کے) نام بتا دیے۔ پھر اُن چیزوں کو فرشتوں کے روبرو پیش کر کے فرمایا کہ اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو ہم کو (ان چیزوں کے) نام بتاؤ۔

مسئلۂ تقدیر :

اسلام میں مسئلۂ تقدیر نے دو قسم کی عملی گمراہیاں پیدا کر دی تھیں ۔ کچھ لوگ تو تمام اعمال و عبادات کو اس لیے چھوڑ بیٹھے تھے کہ دوزخ و جنّت جو بھی تقدیر میں لکھی جا چکی ہے ، وہ تو لازمی طور پر ملے گی ، اس لیے اعمال و عبادات سے کیا فائدہ ؟ لیکن ڈاکٹر اقبال نے بتایا کہ یہ خیال انسان کے عملی شرف کو کھو دیتا ہے اور اُس کو نباتات و جمادات کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے :

پابندیٔ تقدیر کہ پابندیٔ احکام ؟
یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مردِ خردمند !
اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقلّد ابھی ناخوش ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند[2]

۱- البقرہ ، ۳۱ -
۲- ضربِ کلیم ، ص ٦٣ -

کچھ لوگ ہر قسم کے رندانہ اور اوباشانہ افعال کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ مشیّتِ ایزدی نے ہم کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہے ۔ خواجہ حافظ کے فلسفۂ لذت پرستی کی بنیاد اسی تخیّل پر ہے :

مرا روزِ ازل کارے بجز رندی نفرمودند
هر آں قسمت کہ آں جا شد کم و افزوں نخواهد شد[1]

برو اے ناصح و بر درد کشاں خردہ مگیر
کارفرمائے قدر میکند ایں من چہ کنم[2]

لیکن ڈاکٹر اقبال نے ایک مکالمے میں ، جو خدا اور ابلیس کے درمیان ہوا ہے ، اس خیال کی غلطی ثابت کی ہے ۔ ابلیس کہتا ہے :

اے خدائے کُن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
آہ وہ زندانیٔ نزدیک و دور و دیر و زود
حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود

اس کے بعد خدا نے فرشتوں کی طرف مخاطب ہو کر اس خیال کی غلطی ثابت کی :

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجّت اسے
کہتا ہے تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود

۱۔ دیوانِ حافظ ، ص ۱۳۹ ۔ دوسرا مصرع یوں ہے :
"ہر آں قسمت کہ آنجا رفت ازاں افزوں نخواهد شد"
۲۔ دیوانِ حافظ ، ص ۱۳۹ ۔

دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود[1]

غرض اس قسم کے اور بھی بہت سے مسائل ہیں جن پر ڈاکٹر اقبال نے شاعرانہ انداز میں بحث کی ہے اور اگر اُن سب کو جمع کیا جائے تو ایک نیا علمِ کلام مرتب ہو سکتا ہے؛ بالخصوص ''رموزِ بے خودی'' میں اُنھوں نے خاص طور پر اسی قسم کے مسائل کی تشریح کی ہے؛ مثلاً سب سے پہلے اُنھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ جب تک تمام افراد باہم منضم و مدغم ہو کر متحدہ قومیت کی شکل نہ اختیار کر لیں اُس وقت تک فرد و قوم دونوں کا نظام ابتر رہے گا:

فرد می گیرد ز ملّت احترام
ملّت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

لفظ چوں از بیت خود بیروں نشست
گوہر مضموں بجیبِ خود شکست
برگِ سبزے کز نہالِ خویش ریخت
از بہاراں تارِ امیدش گسیخت[2]

اور پیغمبروں کا کام اسی رشتۂ اتحاد کا مستحکم کرنا ہے۔ اگرچہ

۱- ضربِ کلیم، صفحات ۴۶ - ۴۷ -
۲- اسرار و رموز، ص ۸٦ -

قدرتی اور تمدنی ضروریات کی بنا پر ایک نامکمل قومیت کا وجود ہمیشہ سے رہا ہے، تاہم جب تک کسی پیغمبر نے قومیت کے اس نظام کو مستحکم نہیں کیا اُس وقت تک قومیت کے اصلی جوہر ظاہر نہیں ہوئے۔ اس قسم کی قومیت کو ایک قافلے سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس کے افراد میں باہم اتحاد تو ہو جاتا ہے لیکن اس اتحاد کو مکمل نہیں کہہ سکتے:

خیمہ گاہِ کاروان کوہ و جبل
مرغزار و دامنِ صحرا و تل
سست و بے جاں تار و پودِ کارِ او
نا کشودہ غنچہٴ پندارِ او

. . . .

نودمیدہ سبزۂ خاکش ہنوز
سرد خوں اندر رگِ تاکش ہنوز[1]

پیغمبروں کی بعثت سے پہلے فرد و قوم میں اسی قسم کا ناقص ارتباط ہوتا ہے لیکن جب کوئی پیغمبر مبعوث ہو جاتا ہے تو اس ناقص ارتباط کو مکمل کر دیتا ہے اور یہیں سے قومی ترقی کا دور شروع ہوتا ہے:

تا خدا صاحبدلے پیدا کند
کز فغانے نغمہٴ انشا کند[2]

۱- اسرار و رموز، ص ۸۹ -

۲- موجودہ ایڈیشن میں یہ مصرع یوں ہے:

"کو ز حرفے دفترے املا کند"

رشتہ اش کو بر فلک دارد سرے
پارہ ہائے زندگی را ہمگرے
تازہ اندازِ نظر پیدا کند
گلستاں در دشت و در پیدا کند
از تفِ او ملّتے مثلِ سپند
بر جہد شور افگن و ہنگامہ بند
یک شرر می‌افگند اندر دلش
شعلۂ درگیر می‌گردد گلش[1]

لیکن پیغمبر جس قومیت کو پیدا کرتے ہیں اُس کے چند بنیادی اصول ہوتے ہیں جن میں سب سے مقدم چیز توحید ہے :

بندھا از پا کشاید بندہ را
از خداوندان رباید بندہ را
گویدش تو بندۂ دیگر نہ ای
زیں بتانِ بے زباں کمتر نہ ای
تا سوے یک مدّعایش میکشد
حلقۂ آئین بپایش میکشد[2]

کیونکہ اس توحید سے اور تمام تفرقے مٹ جاتے ہیں اور قومیت کا پرکار صرف ایک نقطے پر گردش کرنے لگتا ہے :

اسود از توحید احمر می‌شود
خویش فاروق و ابوذر می شود

۱- اسرار و رموز ، ص ۹۹ - ۲- ایضاً ، ص ۹۰ -

دل مقامِ خویشی و بیگانگی است
شوق را مستی ز ہم پیمانگی است
ملّت از یک رنگیِ دلہاستے
روشن از یک جلوہ ایں سیناستے

با وطن وابستہ تقدیرِ اُمم
بر نسب بنیادِ تعمیرِ اُمم
اصل ملت در وطن دیدن کہ چہ
باد و آب و گِل پرستیدن کہ چہ[۱]

اسی قسم کے اور بھی بہت سے مباحث اس مختصر سی مثنوی میں موجود ہیں جن پر متعدد مضامین لکھے جا سکتے ہیں ۔

☆ ☆ ☆

۱۔ اسرار و رموز ، صفحات ۹۲ - ۹۳ ۔

۱۱

"تعلیماتِ اقبال" ۔ ایک وضاحت

لکھنؤ کے بعض نوجوان مسلمانوں نے مل کر ادارۂ اقبال کے نام سے ایک مجلس قائم کی ہے جس کا مقصد اقبال کے فلسفے کی اشاعت اور نوجوانوں میں اُن کی تعلیمات کی تبلیغ ہے - ۸ - اپریل کو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں نواب بہادر یار جنگ (حیدرآباد دکن) کی صدارت میں اس کا ایک کامیاب اجلاس ہوا ۔ اس اجلاس کی خصوصیت یہ تھی کہ بوڑھے کارگزار بھی نوجوانوں کے پہلو بہ پہلو موجود تھے ۔

آج کل ڈاکٹر اقبال کے نام سے متعدد رسائل نکل رہے ہیں اور مجلسیں قائم ہو رہی ہیں ۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ اشخاص بھی بتدریج ترقی کر کے منزلِ مقصود کے احاطے میں داخل ہوتے ہیں اور اُن کے خیالات بھی اسی تدریج کے ساتھ کمال کے مرتبے کو پہنچتے ہیں ۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ ہر شئے جو ڈاکٹر اقبال کے کلام کے قائل ہیں نکل آئے وہ ان کی تعلیم ہے تو وہ سراسر غلط ہوگا ، بلکہ وہی چیزیں اُن کی تعلیمات کے عناصر ہوں گی جن پر اُن کے قلم نے ایک

مدت کی تلاش کے بعد آرام کی سانس لی اور جس منزل پر پہنچ کر اُن کے خیالؒ کے مسافر نے اقامت اختیار کی ۔ اس بنا پر آج کل رسالوں کے کارخانوں میں جو مال تیار ہوتا ہے اور اس پر ڈاکٹر اقبال کے نام کا مارکہ لگا کر جو دکان داری کی جا رہی ہے ، وہ ہمّت افزائی کے لائق نہیں ۔

کبھی فرصت سے سن لینا بڑی ہے داستاں میری

("معارف" ، مئی ۱۹۴۲ع)

☆ ☆ ☆

۱۲

علامہ کو خطابِ ملنے پر شذرہ

یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو علامہ اقبال کو ”سر“ کا خطاب دیا گیا ۔ تحریکِ ترکِ موالات کا زمانہ تھا ۔ عوام علامہ جیسی شخصیت کا خطاب یافتہ ہونا سوچ بھی نہ سکتے تھے ۔ ان کے احباب نے بھی اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا ۔ میر غلام بھیک نیرنگ نے ایک خط کے ذریعے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اب وہ شاید آزادیٔ اظہار سے کام نہ لیں گے ۔ علامہ نے جواباً لکھا : ”قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان و آبرو ہے اور قسم ہے اُس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں ، دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی ، انشاء اللہ ۔ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے“ ۔

سیّد صاحب نے خطاب دیے جانے پر ایک دوسرے انداز سے اظہارِ خیال کیا ۔ شذرہ من و عن درج کیا جاتا ہے ۔ (مرتّب)

"سالِ نو کے عجائباتِ خطاب میں ڈاکٹر اقبال کا 'سر اقبال' بن جانا ہے۔ اگر حکومت نے ہمارے قومی شاعر کی یہ علمی قدردانی کی ہے تو یہ فالِ نیک مبارک ہو، اور اسی کے ساتھ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ہماری ملکی زبان کے خدمت گزاروں کی قدردانی انگریز اُس وقت تک نہیں کرتے جب تک اُن کے خیالات رومن خط میں اُن کے پیشِ نظر (نہ) ہوں۔ ڈاکٹر اقبال بیس برس سے مختلف مشرقی زبانوں میں اپنے افکارِ نادرہ اور جذباتِ عالیہ کا اظہار کر رہے ہیں لیکن ہماری حکومت نے ان کا اعتراف اُس وقت کیا جب پروفیسر نکلسن کے قلم سے اُن کے بعض "رموز و اسرارِ" شاعرانہ انگلستان کی بزمِ سخن میں جا کر فاش ہوئے۔"

("معارف" جنوری ۱۹۲۳ء)

☆ ☆ ☆

۱۳

ماتم اقبال

علامہ کی وفات پر ''معارف'' میں مندرجہ ذیل تعزیتی اداریہ شائع ہوا ۔ (مرتب)

وقعت الواقعہ ۔ آخر موت اور حیات کی چند ہفتوں کی کشمکش کے بعد ڈاکٹر اقبال نے دنیائے فانی کو الوداع کہا ۔ صفر کی آنیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو عمر کی اکسٹھ بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبلِ ہزار داستان اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا ہے ۔ وہ ہندوستان کی آبرو ، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا ۔ آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی ہے ۔ ایسا عارف فلسفی ، عاشقِ رسول شاعر ، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملّت کا حُدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو ۔ اُس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگِ درا ، اُس کی جانِ حزیں کی ہر آواز زبورِ عجم ، اُس کے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق اور اُس کے شعر کا ہر پرِ پرواز

بالِ جبریل تھا ۔ اُس کی فانی عمر گو ختم ہوگئی لیکن اُس کی زندگی کا ہر کارنامہ ، جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا ۔ اُمید ہے کہ ملّت کا یہ غم خوار شاعر اب عرشِ الٰہی کے سائے میں ہوگا اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے ۔ خداوندا ! اس کے دلِ شکستہ کی ، جو ملّت کے غم سے رنجور تھا ، غمخواری فرما اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلبِ حزیں کو مسرور کر ! !

مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملّت کی زندگی کے لیے ایک نیا پیام لاتا تھا ۔ وہ توحیدِ خالص کا پرستار ، دینِ کامل کا علم بردار اور تجدیدِ ملّت کا طلب گار تھا ۔ اُس کے رونگٹے رونگٹے میں رسولِ انام علیہ السلام کا عشق پیوست تھا اور اُس کی آنکھیں جسمِ اسلام کے ہر ناسور پر اشک بار رہتی تھیں ۔ اُس نے مستقبل کے اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا ۔ اسی خواب کی تعبیر میں اُس کی ساری عمر ختم ہوگئی ۔ ع :

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں

کہنے کو تو ہم میں ملّت کے غم خواروں کی کمی نہیں اور نہ اُمّت کے دوست داروں کی قلّت ، مگر واقعہ یہ ہے کہ نئی تعلیم نے اپنے ساٹھ ستر برس کے طویل عرصے میں دو ہی سچے مسلمان غم خوار پیدا کیے : ایک محمد علی مرحوم اور دوسرا اقبال مرحوم ۔ دونوں مرحوموں پر خدا کی بڑی رحمت ہو ۔ اُن کے دلوں میں اسلام کا حقیقی سوز تھا اور رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سچا عشق ۔

نئے زمانے کی جھوٹی آب و تاب اور نئے تمدن کی ظاہری چمک دمک سے اُن کی آنکھیں خیرہ نہ تھیں ۔ آفتابِ اسلام کی ضیا باری کے مقابلے میں اُن کے سامنے جدید تہذیب و تمدن اور زمانۂ حال کی تجدیدات کی نئی روشنی مہِ نخشب کے مصنوعی نور سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی ۔ خدا ان کی قبروں کو اپنے نور سے بھر دے ۔

اقبال کی قومی شاعری بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ شروع ہوئی ۔ بیسویں صدی کے اس پیغام رساں نے اپنے اڑتیس برس کے شاعرانہ پیغاموں سے ملّت کے نوجوانوں میں نئی اُمنگ بھر دی اور نئے سفر کے قطع منزل کے لیے ان میں نئے سر سے ہمت پیدا کر دی ۔ اقبال کا یہ دعویٰ حرف بہ حرف سچا تھا :

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اقبال کی تصنیفات زمانے میں یادگار رہیں گی ۔ وہ اسلام کا غیرفانی لٹریچر بن کر انشاء اللہ زندہ رہے گا ۔ اُن کی شرحیں لکھی جائیں گی ، تشریحیں کی جائیں گی ، نظریے ان سے بنیں گے ، ان کا فلسفہ تیار ہوگا ، اُس کی دلیلیں ڈھونڈی جائیں گی ۔ قرآنِ پاک کی آیتوں ، احادیثِ شریفہ کے جملوں ، مولانا رومی اور حکیم سنائی کے تاثرات سے ان کا مقابلہ ہوگا اور اس طرح اقبال کا پیام اب دنیا میں انشاءاللہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اقبال زندۂ جاوید ۔

اقبال صرف شاعر نہ تھا ، وہ حکیم تھا۔ وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چین۔ بلکہ وہ حکیم جو اسرارِ کلامِ الٰہی کے محرم اور رموز شریعت کے آشنا تھے۔ وہ نئے فلسفے کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا ؛ یعنی بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا۔

وفدِ کابل جن تین ممبروں سے بنا تھا ، افسوس ہے کہ اس میں سے یکے بعد دیگرے دو چل دیے ؛ سر راس مسعود اور اقبال۔ اب صرف ایک رہ گیا ہے اور معلوم نہیں کہ وہ بھی کتنے دن کے لیے ہے۔ آہ !

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند

مولانا شبلی مرحوم نے اقبال کو اسی وقت پہچان لیا تھا جب ہنوز ان کی شاعری کے مرغِ شہرت نے پر و بال نہیں پیدا کیے تھے۔ چنانچہ انھوں نے پیشگوئی کی تھی کہ حالی و آزاد کی جو کرسیاں خالی ہوں گی ، ان میں سے ایک اقبال کی نشست سے پُر ہو جائے گی۔ افسوس کہ آج اڑتیس برس کے بعد وہ کرسی بھی خالی ہوگئی اور اب اس کے بھرنے کی کوئی صورت نہیں۔

اقبال ! ہندوستان کا فخر اقبال ! اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال !

فضل و کمال کا پیکر اقبال ! حکمت و معرفت کا دانا اقبال ! کاروانِ ملّت کا راہنما اقبال ! رخصت رخصت ! الوداع ! الوداع ! !

سلام اللہ علیک و رحمتہ الی یوم التلاق۔

(''معارف'' مئی ۱۹۳۸ء)

☆ ☆ ☆

حصہ دوم

مکاتیبِ اقبال

بنام

سیّد سلیمان ندوی

۱

لاہور

یکم نومبر ۱۹۱۶ء

مخدومی ، السلام علیکم

اوریئنٹل کالج لاہور میں ہیڈ پرشین ٹیچر کی جگہ خالی ہوئی ہے - اس کی تنخواہ ایک سو بیس روپیہ ماہوار ہے - میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ اس جگہ کو اپنے لیے پسند فرماتے ہیں ؟ اگر ایسا ہو تو آپ کے لیے سعی کی جائے - آپ کا لاہور میں رہنا پنجاب والوں کے لیے بے حد مفید ہوگا - والسلام

آپ کا خادم

محمد اقبال بیرسٹر ، لاہور

۲

لاہور

۱۲ نومبر ۱۹۱۶ء

مخدومی ، السلام علیکم

مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ ملازمت کوئی قبول نہ کریں گے - سنڈیکیٹ کے بعض ممبروں کی تعمیلِ ارشاد میں آپ کو لکھنا ضرور تھا - کسی قدر خود غرضی کا شائبہ بھی میرے خط میں تھا اور وہ

یہ کہ میں چاہتا تھا کہ جس طرح پنجاب والوں کو صوبہ متحدہ کے علما و فصحا سے اس سے پیشتر فائدہ پہنچا ہے ، اب بھی وہ سلسلہ آپ کے یہاں رہنے سے بدستور جاری رہے ۔ مولانا شبلی مرحوم کی زندگی میں میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح مولانا مرحوم پنجاب میں مستقل طور پر اقامت گزیں ہو جائیں مگر مسلمان امرا میں مذاقِ علمی مفقود ہو چکا ہے ۔ میری کوشش بارآور نہ ہوئی ۔ اللہ تعالیٰ دارالمصنفین کے کام میں برکت دے اور آپ کا وجود مسلمانوں کے لیے مفید ثابت کرے ۔

آپ کی غزل[1] لاجواب ہے ، بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا

۱۔ یہ غزل پہلی بار ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ کے مشاعرے میں پڑھی گئی :

عجیب طرح کا اک پیچ گفتگو میں ہے
وگرنہ 'میں' میں وہی بات ہے جو 'تو' میں ہے
ہے کائنات کا ہر ایک ذرہ گردش میں
پتا جو مل نہ سکا ، تیری جستجو میں ہے
خطابِ غیر میں گو لاکھ احترام رہے
مگر وہ لطف کہاں ہے جو لفظ 'تو' میں ہے
دہن میں تیغ کے اب بھی ہے تشنگی باقی
عجیب لذتِ پنہاں مرے لہو میں ہے
نگاہِ لطف ادھر ہو کہ آ چلا ہے کیف
بچا نہ رکھ مرے ساقی جو کچھ سبو میں ہے
ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے
قفس میں نالہ نہ کر مرغ ! صحن باغ سے دور
کہ لطف شکوۂ یارانہ روبرو میں ہے

(ارمغانِ سلیمان)

پسند آیا :

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا اور چند نظمیں انھوں نے لکھی تھیں۔ وہ نہایت مقبول ہوئیں۔ غزل کے ساتھ وہ سلسلہ بھی جاری رکھیے۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص ، محمد اقبال ، لاہور

۳

لاہور

۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء

مخدومی ، السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ قوتِ روح اور اطمینانِ قلب کا باعث ہے۔ میں ایک مدت کے مطالعے اور غور و فکر کے بعد انھی نتائج پر پہنچا ہوں جو آپ کے والا نامے میں درج ہیں۔ جو کام آپ کر رہے ہیں ، جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اللہ اور اس کے رسول آپ کو اس کا اجر عطا فرمائیں گے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔

آپ کو ''خیر القرون قرنی''[1] والی حدیث یاد ہوگی - اس میں نبی کریمؐ فرماتے ہیں کہ میری امت میں تین قرنوں کے بعد سمن (و یظھر فیھم السمن) کا ظہور ہوگا - میں نے اس پر دو تین مضامین اخبار 'وکیل' امرتسر میں شائع کیے تھے جس کا مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ سمن سے مراد رہبانیت ہے جو وسطِ ایشیا کی اقوام میں مسلمانوں سے پہلے عام تھی - آئمہ محدثین نے ، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ، یہ لکھا ہے کہ اس لفظ سے مراد عیش پرستی ہے مگر لسانی تحقیق سے محدثین کا خیال صحیح نہیں نکلتا - افسوس ہے کہ عدیم الفرصتی اور علالت کی وجہ سے میں ان مضامین کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکا - میرا تو عقیدہ ہے غلو فی الزہد اور مسئلہ وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ (سمنیت) مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہے - خواجہ نقشبند[2] اور مجددِ سرہند[3] کی میرے دل میں بہت بڑی عزت ہے ، مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے - یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں ، حالانکہ حضرت محی الدین[4] کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا -

---

۱- ترجمہ : زمانوں میں سے بہترین زمانہ میرا ہے -

۲- امام الطریقہ خواجہ بہاء الدین نقشبند (م ۳ ربیع الاول ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ع) -

۳- شیخ احمد سرہندی (م صفر ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ع)

۴- خواجہ محی الدین عبدالقادر جیلانی (م ۱۱ ربیع الاخری ۵۶۱ھ/۱۱۶۶ع) امامِ طریقہ قادریہ -

مؤلف سے میری مراد ایڈیٹر کتاب الطواسین[1] موسیو میسگنان ہے جس نے فرانسیسی زبان میں طواسین کے مضامین پر حواشی لکھے ہیں ۔ ان شاء اللہ معارف[2] کے لیے کچھ نہ کچھ لکھوں گا ۔ میری صحت بالعموم اچھی نہیں رہتی ، اس واسطے بہت کم لکھتا ہوں ۔ مثنوی ''اسرارِ خودی'' کا دوسرا حصہ یعنی ''رموزِ بے خودی'' (اسرارِ حیاتِ ملّیہ اسلامیہ) قریب الاختتام ہے ۔ شائع ہونے پر ارسالِ خدمت کروں گا ۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔

مخلص ، محمد اقبال

۴

لاہور

۲۸ اپریل ۱۹۱۸ء

مخدومی ، السلام علیکم

والا نامہ ابھی ملا ہے ۔ ''رموزِ بے خودی'' میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھجوائی تھی ۔ ریویو کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔

آج مولانا ابوالکلام[3] کا خط آیا ہے ۔ انھوں نے بھی میری اس ناچیز کوشش کو بہت پسند فرمایا ہے ۔ مولانا شبلی[4] رحمۃ اللہ علیہ

۱۔ تالیف حسین بن منصور حلاج (م ۳۰۹ھ / ۹۲۲ء) ۔ موسیو میسگنان (فرانسیسی مؤرخ و ادیب) نے ترتیب و تحشیہ کے ساتھ شائع کی تھی ۔

۲۔ مجلۂ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۔

۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد (م ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۸ء)۔

۴۔ (م ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء) ۔

کے بعد آپ استاد الکل ہیں ۔ اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہوگا ۔ ''اسرارِ خودی'' کا دوسرا ایڈیشن تیار کر رہا ہوں ۔ عنقریب آپ کی خدمت میں مرسل ہوگی ۔

رسالۂ 'صوفی'[۱] میں میں نے کوئی نظم شائع نہیں کی ۔ کوئی پرانی مطبوعہ نظم انھوں نے شائع کر دی ہوگی ، ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں 'صوفی' کو 'معارف' پر ترجیح دوں ۔ 'معارف' ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارتِ ایمانی میں ترقی ہوتی ہے ۔ میں انشاء اللہ ضرور آپ کے لیے کچھ لکھوں گا ۔ یہ وعدہ کچھ عرصہ ہوا ، میں نے آپ سے کیا تھا اور میں اس وقت تک پورا نہیں کر سکا ۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔ والسلام

مخلص ، محمد اقبال ، لاہور

۱- مولوی محمد دین کی ادارت میں منڈی بہاء الدین سے شائع ہوتا تھا ۔ گاہے ماہے علامہ کی منظومات اس میں شائع ہوتی رہی ہیں ۔

۵

لاہور

۱۰ مئی ۱۹۱۸ع

مخدوم مکرم جناب قبلہ مولوی صاحب ، السلام علیکم

'معارف' میں ابھی آپ کا ریویو (مثنوی "رموز بے خودی" پر) نظر سے گزرا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے ، وہ میرے لیے سرمایۂ افتخار ہے ۔ اللہ تعالٰی آپ کو جزائے خیر دے ۔

صحت الفاظ و محاورات کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے ، ضرور صحیح ہوگا ، لیکن اگر آپ ان لغزشوں کی طرف بھی توجہ فرماتے تو میرے لیے آپ کا ریویو زیادہ مفید ہوتا ۔ اگر آپ نے غلط الفاظ و محاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے مجھے ان سے آگاہ کیجیے کہ دوسرے ایڈیشن میں ان کی اصلاح ہو جائے ۔ غالباً آپ نے "رموز بے خودی" کے صفحات پر ہی نوٹ کیے ہوں گے ۔ اگر ایسا ہو تو وہ کاپی ارسال فرما دیجیے ۔ میں دوسری کاپی اس کے عوض میں آپ کی خدمت میں بھجوا دوں گا ۔

اس تکلیف کو میں ایک احسان تصوّر کروں گا ۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔

مخلص ، محمد اقبال ، لاہور

۶

مخدومی مولانا ، السلام علیکم

چند اشعار 'معارف' کے لیے ارسالِ خدمت ہیں ۔ ان میں سے جو پسند آئے اُسے شائع کیجیے ۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا :

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا ، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری ، تو قتیلِ شیوۂ آذری
میں نوائے سوختہ در گلو ، تو پریدہ رنگ ، رمیدہ بو
میں حکایتِ غمِ آرزو ، تو حدیثِ ماتمِ دلبری
مرا عیش غم ، مرا شہد سم ، مری بود ہم نفسِ عدم
ترا دل حرم ، گروِ عجم ، ترا دیں خریدۂ کافری
تری راکھ میں ہے اگر شرر ، تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری
کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا
کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشتِ سمندری
گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری
کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغِ سکندری[1]

والسلام

مخلص ، محمد اقبال ، لاہور

۲۳ مئی ۱۹۱۸ء

۱۔ "بانگِ درا" ، نظم 'میں اور تو' ۔

۷

لاہور

۸ ستمبر[1] ۱۹۱۸ع

مخدومی ، السلام علیکم

"رموز بے خودی" کی لغزشوں سے آگاہ کرنے کا وعدہ آپ نے کیا تھا ۔ اب تو ایک ماہ سے بہت زیادہ عرصہ ہو گیا ۔ امید کہ توجہ فرمائی جائے گی تاکہ میں دوسرے ایڈیشن میں آپ کے ارشادات سے مستفید ہو سکوں ۔

"دساتیر"[2] کے حوالوں کے متعلق آپ نے لکھا تھا ۔ اُس وقت اورینٹل کالج لاہور کا کتب خانہ بند تھا اور اب بھی بند ہے ۔ اکتوبر میں کھلے گا ۔ اگر کچھ حوالے دستیاب ہوگئے تو عرض کروں گا ۔ والسلام

مخلص ، محمد اقبال

روس کے مسلمانوں کے متعلق جو مضمون 'معارف' میں شائع ہوا ہے ، اُسے ایک علیحدہ رسالے کی صورت میں شائع کرنا چاہیے ۔

محمد اقبال

۱۔ "اقبال نامہ" میں "دسمبر ۱۹۱۸ع" درج ہے مگر دسمبر درست نہیں ۔ "ستمبر" ہونا چاہیے ، جیسا کہ مکتوب میں اورینٹل کالج کے اکتوبر میں کھلنے کا ذکر ہے ۔

۲۔ زردشتیوں کی مقدس کتاب ۔ لیکن اُن کا ایک گروہ اسے جعلی قرار دیتا ہے اور اسے جلال الدین اکبر کے زمانے کی تالیف سمجھتا ہے ۔

۸

لاہور

۳ - اکتوبر ۱۹۱۸ء

مخدوم مکرم جناب مولانا ، السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ مل گیا ہے جس کے لیے نہایت ممنون ہوں - مجھے اس سے بہت فائدہ پہنچے گا - میں چند روز کے لیے شملہ گیا تھا ، وہاں معلوم ہوا کہ آپ بھی وہاں تشریف رکھتے ہیں - افسوس ہے کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکی - مجھے ایک ضروری کام درپیش تھا جس میں مصروفیت رہی - البتہ معنوی طور پر آپ کی صحبت رہی کیونکہ رات کو ''سیرتِ نبوی'' کا مطالعہ رہتا تھا - مولانا مرحوم[1] نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے جس کا صلہ دربارِ نبوی سے عطا ہوگا -

قوافی کے متعلق جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ، بالکل بجا ہے مگر چونکہ شاعری اس مثنوی[2] سے مقصود نہ تھی اس واسطے میں نے بعض باتوں میں عمداً تساہل برتا - اس کے علاوہ مولانا روم[3] کی مثنوی میں قریباً ہر صفحے پر اس قسم کے قوافی کی مثالیں ملتی ہیں اور ظہوری[4] کے ''ساقی نامہ'' کے چند اشعار بھی زیر نظر تھے - غالباً

۱- شبلی نعمانی (م ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء) -

۲- اسرارِ خودی -

۳- صاحبِ مثنوی (م ۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء) -

۴- نور الدین محمد ظہوری ، ملک الشعراے ابراہیم عادل شاہ ، (م ۱۰۲۴ھ/ ۱۶۱۵ء) -

اور مثنویوں میں بھی ایسی مثالیں ہوں گی ۔

اصول تشبیہ کے متعلق کاش آپ سے زبانی گفتگو ہو سکتی ۔ قوت واہمہ کے عمل کے رو سے بیدل[1] اور غنی[2] کا طریق زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ، گو کتب بلاغت کے خلاف ہے ۔ زمانۂ حال کے مغربی شعرا کا بھی طرز عمل یہی ہے ، تاہم آپ کے ارشادات نہایت مفید ہیں اور میں ان سے مستفید ہونے کی پوری کوشش کروں گا ۔

بحر تلخ رو ، کامہ بسکون لام ، باریک تر از جو (بمعنی کم در عرض و عمق) کوری ذوق ، محفل از ساغر رنگین کردن ، سرمۂ او دیدۂ مردم شکست ، ساز برق آہنگ ، از گل غربت (بمعنی شر) ، نوا بالیدن ، صبح آفتاب اندر قفس وغیرہ کی مثالیں اساتذہ میں موجود ہیں ۔ مگر اس خیال سے کہ آپ کا وقت ضائع ہوگا ، نظرانداز کرتا ہوں ، البتہ اگر آپ اجازت دیں تو لکھوں گا ، محض یہ معلوم کرنے کے لیے کہ میں نے غلط مثالیں تو انتخاب نہیں کیں ۔

ایک امر دریافت طلب ہے ، اس سے آگاہ فرما کر ممنون کیجیے : ”قطرۂ از نرگس شہلاستی“ پر جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے ، میں نہیں سمجھ سکا ۔ کیا آپ کا یہ مقصود ہے کہ قطرہ کا لفظ شہلا کے لیے (یعنی قطرۂ شہلا) موزوں نہیں یا کچھ اور ؟ علی ہذا القیاس ”خیمہ برزد در حقیقت از مجاز“ ، ”نعرۂ زد شیرے از دامان دشت“ ،

۱- عبدالقادر بیدل عظیم آبادی (م ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ع) ۔

۲- غنی کاشمیری (م ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ع) ۔

''بازبانت کلمۂ توحید خوانند'' کے متعلق بھی یہی سوال ہے ۔
امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا ۔ اس طویل خط کے لیے معافی چاہتا ہوں ۔

مخلص ، محمد اقبال

۹

لاہور
۰ - نومبر ۱۹۱۸ع

مخدومی ، السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ
کئی روز ہوگئے ایک عریضہ خدمت عالی میں لکھا تھا ۔ جواب سے ہنوز محروم ہوں ۔ ''خیمہ برزد از حقیقت در مجاز'' کے متعلق آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''از'' میں تجاوز کا مفہوم نہیں ہے ، کیونکہ 'خیمہ برزدن' کے معنی قیام کرنے کے ہیں ۔ میں تلاش میں تھا کہ کوئی سند مل جائے ، جیسا کہ میں نے گزشتہ خط میں عرض بھی کیا تھا ۔ آج ''کلیات سعدی'' میں وہ سند مل گئی جو ارسال خدمت ہے :

صوفی از صومعہ گو خیمہ بزن در گلزار
وقت آں نیست کہ در خانہ نشینی بیکار

بصیری[1] کو چادر عطا ہونا کئی روایات میں آیا ہے ۔ گزشتہ

---

۱ - شرف الدین بوصیری صاحب ''قصیدہ بردہ'' (م ۶۹۴ھ یا ۶۹۵ھ/ ۹۶ - ۱۲۹۵ع) -

خط میں اس کا حوالہ لکھنا بھول گیا تھا ۔ مولوی ذوالفقار علی دیوبندی[1] نے شرحِ 'قصیدۂ بردہ' میں منجملہ اور روایات کے یہ روایت بھی لکھی ہے ۔ مطلع فرمائیے کہ جو اسناد میں نے اپنے خطوط میں لکھے ہیں اُن کی نسبت آپ کی کیا رائے رہے ؟ الفاظ ''ورثہ'' اور ''خیال'' کے متعلق بھی عرض کروں گا ۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا ۔

آپ کا مخلص ، محمد اقبال

۱۰

لاہور

۲۳ اکتوبر ۱۹۱۸ء

مخدومی ، السلام علیکم

آپ کے دونوں نوازش نامے مل گئے جن کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔ میں بخار میں مبتلا تھا اس لیے جواب نہ لکھ سکا ۔ اس کے علاوہ ٹیک چند[2] بہار کی ''ابطالِ ضرورت'' میرے پاس لاہور میں موجود نہ تھی ۔ اس رسالے میں لفظ 'کلمہ' پر بحث ہے ، دیکھ کر جواب عرض کروں گا اور باقی اسناد بھی لکھوں گا ۔

۱۔ شاگرد مملوک علی نانوتوی ، دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے تھے ۔ 'دیوانِ حماسہ' کی شرح 'تسہیل الدراسہ' ، 'قصیدۂ بردہ' کی شرح 'عطر الوردہ' اور 'دیوانِ متنبّی' کی شرح 'تسہیل البیان' کے مصنف ہیں ۔ ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں وفات پائی ۔

۲۔ مؤلفِ ''بہارِ عجم'' (م ۱۷۸۲ء) ۔

"سیر" فارسی میں ان معنوں میں آتا ہے سیر کردن ، سیر زدن ، سیر داشتن ، بلکہ سیر دیدن بھی ۔

عمر ها صائب بشہر عقل بودم کوچہ بند
مدتے ہم با غزالان سیرِ صحرا می زنم

مخلص کاشی[1] :

تماشا دارد اے مہ با تو سیر گلستاں کردن
کہ از شرمِ رخت ہر گل بچندیں رنگ خواہد شد

لفظ 'نعرہ' حیوانات کی آواز کے لیے بھی آتا ہے ۔ اس وقت 'نعرۂ اسپ' کی سند موجود ہے ، اور مجھے یاد ہے شیر کے لیے بھی مستعمل ہوا ہے ۔ انشاء اللہ عرض کروں گا ۔ مگر میں نے اور وجوہ سے اس شعر میں ترمیم کر دی ہے ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ 'غریدن' بہت بہتر ہے ۔

'دشت' اور 'بیشہ' مرادف بھی آتے ہیں اور دشت کے لیے ضرور نہیں کہ بالکل خشک ہو ۔

مپرس از آب و رنگِ کوہسارش
ہزاراں دشتِ لالہ داغدارش

(یحییٰ شیرازی[2])

دشت در معنی آبادی و ویرانہ آیا ہے اور معنی کاشت کے پیدا کرتا ہے ، مگر اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں کہ میں نے ہر دو اشعارِ زیرِ بحث میں ترمیم کر دی ہے ۔ دشت و در ایسا ہی ہے

---

۱ ، ۲- ایران کے فارسی کے دوسرے درجے کے شاعر ۔

جیسے کوہ و دشت ، پست و بلند سے تقطیع بھی نہیں گرتی ۔ آپ نے مصرع صحیح نہیں لکھا ''نعرۂ زد شیرے در دامانِ دشت'' نہیں بلکہ ''نعرۂ زد شیرے از دامانِ دشت'' ہے ۔ باقی باتیں انشاء اللہ دوسرے خط میں عرض کروں گا ۔

جس توجہ سے آپ نے تنقیدی خطوط لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے ، اُس کے لیے نہایت شکر گزار ہوں ۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔

مخلص ، محمد اقبال ، لاہور

۱۱

لاہور

۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ع

مخدومی ، السلام علیکم

اسناد حسبِ وعدہ حاضر ہیں :

۱۔ از گلِ غربت زباں گم کردۂ (رموز)

آپ کا ارشاد اس مصرع پر یہ تھا کہ ''از گل'' بمعنی بدولت اچھے معنوں میں آتا ہے ، برے معنوں میں نہیں آتا ۔ ''بہارِ عجم'' میں زیرِ لفظِ ''گل'' یہ محاورہ بھی دیا ہے اور اشعار بھی دیے ہیں :

زیردستِ چرخ بودن از گلِ بے فطرتی ست (الخ)

۲۔ محفلِ رنگیں بیک ساغر کند (رموز)

نہ ہفتاد و دو ملّت گردشِ چشمِ تو می سازد
بیک پیمانہ رنگیں کردۂ یک شہرِ محفل ہا
(ناصر علی[1])

۳- "سرمۂ او دیدۂ مردم شکست" (رموز)
"چشم و گوش شکستن ، یعنی نابینا شدن" -
(بہار عجم)

ترسم ز گریہ چشم گہربار بشکنند (الخ)
(صائب[2])

۴- عشق را داغے مثالِ لالہ بس
در گریبانش گلِ یک نالہ بس (رموز)

"گلِ نالہ" پر آپ کا ارشاد :

چنگیے بتارِ نغمۂ قانون شیر زن
گلبرگ نالۂ بگریبانِ دل فشاں (زلالی[3])

۵- ز آسمانِ آبگوں یم می چکد
من ز جو باریک تر می سازمش (الخ) (رموز)

لفظ "باریک" پر آپ کا ارشاد تھا کہ صحیح نہیں ، باریک

۱- ناصر علی سرہندی (م ۱۶۹۷ع/۱۱۰۸ھ) مریدِ شیخ محمد معصوم سرہندی -
۲- صائب تبریزی اصفہانی (م ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۶ع) ملک الشعرائے شاہ عباس صفوی دوم -
۳- ملک الشعرائے شاہ عباس صفوی اول ، (م ۱۰۲۴ھ یا ۱۰۳۱ھ/۱۶۱۵ع یا ۱۶۲۱ع) -

بمعنیٔ کم در عرض و عمق بھی آیا ہے ۔

نازک تر است از رگِ جاں گفتگوئے من
باریک شد محیط چو آمد بجوئے من (صائب)
از تواضع می تواں مغلوب کردن خصم را
می شود باریک چو سیلاب از پُل بگذرد

۶۔ کور ذوقاں داستانہا ساختند (الخ) (رموز)

''کور ذوق'' کی نسبت آپ کا ارشاد تھا کہ بے مزہ ترکیب ہے :

چہ غم زیں عروسِ سخن را بتر
کہ بر کورذوقاں شود جلوہ گر (ظہوری)
کور ذوقاں ز فیضِ تربیتت
چوں مسیحا مزاجدانِ سخن (مُلا طغرا[۱])

۷۔ نو ابالیدن :

تانوائے یک اذاں بالیدہ است
(رموز)
تا چند ببالد نفس اندر دو نوایم (بیدل)

۸۔ بحرِ تلخ رو :

بود بحرِ تلخ رو یک سادہ دشت (رموز)

'تلخ رو' بحر کی صفات میں آتا ہے ۔ (بہارِ عجم)

۹۔ نعرۂ زد شیرے از دامانِ دشت (رموز)

منجملہ اور ارشادات کے ایک یہ ارشاد تھا کہ لفظ 'نعرہ' شیر

۱۔ مراد بخش ابنِ شاہجہاں کا درباری شاعر (مدفون در کشمیر) ۔

کے لیے ٹھیک نہیں - ''بہارِ عجم'' میں ایک شعر دیا ہے جس میں 'نعرۂ اسپ' لکھا ہے -

''بابر ماند چو بے پر نہاد و نعرہ کشاد -''

(معتز فطرت[1])

۱۰- ساز برق آہنگ او ننواختہ (رموز)

آپ کا ارشاد تھا کہ 'سازِ برق' صحیح نہیں - لیکن مصرع میں 'ساز' کی صفت 'برق آہنگ' ہے اور برق آہنگ ، ساز کی صفت آتی ہے - (بہارِ عجم ، زیرِ لفظ ساز)

۱۱- ہم چو صبحِ آفتاب اندر قفس (رموز)

آپ کا ارشاد تھا کہ صبح کے لیے آفتاب کی کیا ضرورت ہے - یہ ترکیب مرزا بیدل کی ہے - میں نے اس کے لیے محلِ استعمال نیا پیدا کیا ہے ؛ یعنی کعبۃ اللہ کے گردا گرد جب ملّتِ بیضا نماز پڑھتی ہے یا طواف کرتی ہے تو یہ نظارہ صبح آفتاب در قفس سے مشابہ ہے -

ملّتِ بیضا بہ طوفش ہم نفس
ہم چو صبحِ آفتاب اندر قفس

۱۲- اے بصیری را ردا بخشندۂ (رموز)

بصیری کے متعلق بھی یہی واقعہ مشہور ہے - فرق صرف اس قدر ہے کہ حضور ؐ نے بصیری کو ، جو جذام میں مبتلا تھا ، اپنی چادرِ مطہّر خواب میں عطا فرمائی تھی جس کے اثر سے اس نے جذام

۱- موسوی خاں میرزا معزالدین محمد (م ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹-۹۰ء) -

سے نجات پائی - بعض لوگوں میں قصیدۂ بصیری ، قصیدۂ بردہ کے نام سے مشہور ہے -

۱۲- من شبے صادق را دیدم بخواب
گل ز خاکِ راہ او چیدم بخواب

دوسرے مصرع پر آپ کا ارشاد تھا کہ مطلب زیادہ واضح ہونا چاہیے اور "گل ز خاکِ راہِ او چیدم" کیا مطلب ؟ یہ واقعہ خواب کا ہے - جو خواب میں دیکھا گیا ، بعینہ اسی طرح نظم کر دیا گیا -

۱۳- با زبانت کلمۂ توحید خواند

لفظ 'کلمہ' کے متعلق بھی لکھوں گا - افسوس ہے کہ "ابطالِ ضرورت"[۱] دستیاب نہیں ہوئی - مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس رسالے میں اس لفظ پر بحث ہے - بہت سے الفاظ جن کو اساتذہ نے بتحریک و بسکون دونوں طرح استعمال کیا ہے ، انھوں نے کمی کر دی ہے : مثلاً ربِ اَرنی ، رمضان ، حرکتِ متوازی و قران وغیرہ - اس کا بسکون استعمال ہونا یقینی ہے - اسناد انشاء اللہ عرض کروں گا - "جواہر الترکیب" میں چار دفعہ بسکونِ لام آیا ہے -

۱۵- فرد و قوم آئینۂ یک دیگراند
ہم خیال و ہم نشین و ہمسرند

۱- تالیف ٹیک چند بہار (م ۱۷۸۲ع) -

لفظ 'ہم خیال' کی نسبت آپ کو شبہ تھا :

یاد ایامیکہ باھم آشنا بودیم ما
ہم خیال و ہم صفیر و ہم نوا بودیم ما

لیکن میں نے یہ لفظ شعر سے نکال دیا ہے۔

۱۶- بائے بسم اللہ (حضرت علیؓ کے لیے) قاآنی[1] نے لکھا ہے اور میم مروت مولانا جامی[2] نے ''تحفۃ الاحرار'' میں لکھا ہے۔ میں نے ''میم مرگ'' لکھا تھا۔

۱۷- قوافی کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا، صحیح ہے۔ قاعدہ یہی ہے جو آپ تحریر فرماتے ہیں۔ مولانا روم ان باتوں کی پروا نہیں کرتے۔ ظہوری کے دو شعر، جو زیرِ نظر تھے، عرض کرتا ہوں :

گل شوقم از آب و گل بردمد
بہ رقاصی از سینۂ دل جہد
چو از چشمِ جادو بجادو رود
باعجاز پہلو بہ پہلو زند

دوسرا شعر کسی قدر مشتبہ ہے۔ کوئی اور ایڈیشن ''ساقی نامہ'' کی دستیاب نہیں ہوئی ورنہ مقابلہ کرتا۔ بہرحال قاعدے کی خلاف ورزی کیے بغیر اگر شعر لکھا جا سکتا ہو تو قاعدہ توڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ انشاء اللہ ان قوافی پر نظر ڈالا کروں گا۔

۱- حکیم حبیب قاآنی شیرازی (م ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ع)۔
۲- نورالدین عبدالرحمان جامی (م ۸۹۷ھ/۱۴۹۲ع)

۱۸- ورثہ ، دورہ ، خیال وغیرہ کے متعلق آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے لیکن ان الفاظ کے متعلق پھر بھی کچھ عرض کروں گا :

۱۹- ''شاہِ رمز آگاہ شد محوِ نماز
خیمہ بر زد از حقیقت در مجاز
نعرۂ زد شیرے از دامانِ دشت
دشت و در از هیبتش لرزندہ گشت

ان اشعار کے متعلق جو کچھ آپ کا ارشاد ہے ، اس سے مولوی اصغر علی روحی[1] پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور اتفاق نہیں کرتے۔ لیکن فی الحال ان پیش کردہ اسناد سے مجھے تسکین نہیں ہوئی ۔ دو چار روز تک نتیجہ عرض کروں گا ۔ ان اسناد کو ملاحظہ فرمائیے اور بتائیے کہ کون سی صحیح اور کون سی غلط ہے ۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔ والسلام

آپ کا مخلص ، محمد اقبال ، لاہور

۱۲

لاہور

دوسری دسمبر ۱۹۱۸ء

مخدومی ، السلام علیکم

والا نامہ مل گیا ہے ۔ حالات معلوم ہونے پر طبیعت بہت متاثر

۱- پروفیسر اسلامیہ کالج و اورینٹل کالج لاہور ، عربی و فارسی کے شاعر ، مؤلفِ دبیر عجم ، ما فی الاسلام اور العروض والقوافی ۔ (م ۱۳۷۳ھ - ۱۹۵۴ء) ۔

ہوئی ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اطمینانِ قلب عطا فرمائے ۔ آپ کا یہ فقرہ کہ ''میرے ساتھ خدا کا معاملہ عجیب ہے'' گویا تمام ملتِ مرحومہ کے احساسات کا ترجمان ہے ۔ جو قوم ایک مشن لے کر پیدا ہوئی ہے اُس کی روحانی تربیت کے لیے ابتلا کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ۔ ایک انگریزی مصنّف ، جسے ابتلا کے دور رس نتائج کا تجربہ ہو چکا تھا ، لکھتا ہے کہ ''دکھ دیوتاؤں کی ایک رحمتِ عظیم ہے تاکہ انسان زندگی کے ہر پہلو کا مشاہدہ کر سکے ۔'' آپ اُمتِ محمدیہ کے خاص افراد میں سے ہیں اور اس مامور من اللہ قوم کے خاص افراد کو ہی امرِ الٰہی ودیعت کیا گیا ہے ۔ فرقۂ یاسیہ کو چھوڑ کر فرقۂ رجائیہ میں آ جائیے ۔ جس حقیقت کو آپ زیرِ پردہ دیکھ چکے ہیں اُس کی بے نقابی کا زمانہ قریب ہے ، انشاء اللہ :

زمانہ باز بیفروخت آتشِ نمرود
کہ بے نقاب شود جوھر مسلمانی

شخصی اعتبار سے مجھے آپ کے ساتھ حد درجہ ہمدردی ہے ۔ یقین جانیے کہ آپ کے الفاظ نے میرے دل پر سوز و گداز کی کیفیت طاری کردی اور میں دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آلام و مصائب میں استقامت عطا فرمائے ۔

ہاں ترجمے کی داد دیتا ہوں ۔ لٹریری اغراض کے لیے یہ ترجمہ نہایت عمدہ ہے ۔ میرے خیال میں اس سے بہتر الفاظ نہ مل سکیں گے ۔ البتہ فلسفیانہ اغراض کے لیے شاید اور الفاظ وضع کیے جائیں تو بہتر ہوگا ۔

پنجاب میں بھی بیماری[1] نے غضب ڈھایا ۔ لاہور میں تو چند روز یہ حالت رہی کہ گورکن بھی نہ مل سکتے تھے ۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔

آپ کا مخلص ، محمد اقبال

۱۳

لاہور

۲۳ مارچ ۱۹۱۹ء

مخدومی ، السلام علیکم

ایک عرصے سے آپ کی خیریت معلوم نہیں ہوئی ۔

'معارف' میں حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قبلہ[2] کا ایک خط شائع ہوا ہے جس میں آنھوں نے طرفہ[3] کا ایک مقبول عربی شعر نقل کیا ہے ۔ کیا آپ یہ بتانے کی زحمت گوارا کر سکتے ہیں کہ یہ خط مالطہ سے کون سی تاریخ کو لکھا گیا تھا ؟ صاحبِ مضمون نے خط کی تاریخ نہیں بتائی ۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا ۔ والسلام

مخلص ، محمد اقبال

۱- پہلی عالمگیر جنگ کے بعد انفلوئنزا کی مہلک وبا نمودار ہوئی تھی ۔

۲- شیخ الہند مولانا محمود الحسن (م ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء) ۔ صدر مدرس دارالعلوم دیوبند ۔

۳- عہدِ جاہلی کا ایک شاعر ۔ "سبعہ معلقہ" کا ایک قصیدہ اُس کی طرف منسوب ہے ۔

۱۴

لاہور

۳ اپریل ۱۹۱۹ء

مخدومی ، السلام علیکم

والا نامہ ملا جس کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔ الحمد للہ کہ مولانا آزاد کو آزادی[1] ملی ۔ کیفِ باطن میں بالخصوص آج کل ''صحو'' ہی کی ضرورت ہے ۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ کی تربیت اسی حال میں کی تھی ۔ ''سکر'' کی حالت عمل کی دشوارگزار منزل کو طے کر لینے کے بعد ہو تو مفید ہے ۔ باقی حالات میں اس کا اثر روح پر ایسا ہی ہے جیسا جسم پر افیون کا ۔ مولانا آزاد اب کہاں ہیں ؟ پتہ لکھیے کہ ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں ۔

میری خامیوں سے مجھے ضرور آگاہ کیا کیجیے ۔ آپ کو زحمت تو ہو گی لیکن مجھے فائدہ ہوگا ۔ ''بادۂ نارسا''[2] کے لیے مجھے کوئی سند یاد نہیں ۔ بادۂ نارس یا میوۂ نارس (بمعنی خام) لکھتے ہیں ۔ لفظ مینار[3] غلط ہے ، صحیح لفظ منار (بغیر 'ی' کے) ہے ۔ یہ الفاظ اُس زمانے کی نظموں میں واقع ہوئے ہیں جس زمانے میں میں سمجھتا تھا کہ لٹریچر میں ہر طرح کی آزادی لے سکتے ہیں ، یہاں تک کے بعض نظموں میں میں نے اصولِ بحر کا بھی خیال نہیں کیا اور ارادۃً ۔

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد رانچی کی نظربندی سے جنگ کے بعد رہا ہوئے تھے ۔ (س) ۔

۲ ، ۳۔ یہ دو غلط لفظ اقبال نے استعمال کیے تھے (س) ۔

مجموعہ[1] اب تک مرتب نہ ہو سکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب ان تمام لفظوں پر نظر ثانی کرنا چاہتا ہوں جس کے لیے فرصت نہیں ملتی۔ انشاء اللہ بعد از نظرثانی شائع کروں گا۔ اگرچہ مقصود اس شعرگوئی کا نہ شاعری ہے نہ زبان۔ مولانا گرامی جالندھری[2] (شاعرِ حضورِ نظام) نے ایک غزل لکھ کر ڈاک میں ارسال کی ہے جس کے اشعار عرض کرتا ہوں۔ پسند ہوں تو 'معارف' میں شائع کیجیے:

پنہانم و پیدایم، کیفم بشراب اندر
پیدایم و پنہانم، داغم بکباب اندر

دیباچۂ بودم ہیچ، انگیز وجودم ہیچ
مضمونِ خیالم من پیچیدہ بخواب اندر

آن نکتہ کہ عارف را آورد بوجد این است
جان ہست بجسم اندر، دریا بہ حباب اندر

از موسیِ من می پرس از غیر چہ می پرسی
شوقم بسوال اندر، ذوقم بجواب اندر

رمزیست حکیمانہ، می خوانم و می رقصم
خواب است بمرگ اندر مرگ است بخواب اندر

در کشمکشِ لائیم، در جذبۂ الّائیم
ہیچیم و ہمہ مائیم، چوں عکس بآب اندر

۱۔ اُردو نظموں کا مجموعہ۔
۲۔ علامہ کے بے تکلف دوست، شاعرِ دربارِ دکن (م ۲۶ مئی ۱۹۲۷ء/ ۱۳۴۵ھ)۔

دیدیم گرامی را در خلد بریں اشب
ابلہ بہ بہشت اندر ، دانا بعذاب اندر

مخلص ، محمد اقبال ، لاہور

۱۵

لاہور
۲۶ - اگست ۱۹۱۹ء

مخدومی ، السلام علیکم

'معارف' میں ابھی تصوف و تناسخ پر ایک مضمون نظر سے گزرا - "ہندوستان ریویو" میں بھی میں نے یہ مضمون دیکھا تھا - خیر علمی اعتبار سے تو اس کی وقعت کچھ بھی نہیں ، البتہ ایک بات آپ سے دریافت طلب ہے - "ہم چو سبزہ بارہا روئیدہ ام" (الخ) کی نسبت آپ نے لکھا ہے کہ یہ مولانا[1] کا شعر ہے - مجھے ایک عرصے سے اس میں تامل ہے - مثنوی کبھی شروع سے لے کر آخر تک پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا مگر ایک قابلِ اعتبار بزرگ نے ، قریباً چار سال ہوئے ، مجھ سے کہا تھا کہ یہ شعر مولانا کا نہیں ہے اور نہ مثنوی میں ہے - اگر مثنوی کے کسی ایڈیشن میں آپ کی نظر سے یہ شعر گزرا ہو تو مہربانی کر کے ایڈیشن اور صفحے کا حوالہ دے کر ممنون فرمائیے[2] - زیادہ کیا عرض کروں - امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا -

آپ کا مخلص ، محمد اقبال ، لاہور

۱- مولانا روم (م ۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء) -
۲- یہ شعر مولانا کی مثنوی میں نہیں - مولانا کے کلیات میں ہے (سید سلیمان ندوی) -

۱۶

لاہور

۱۷ ستمبر ۱۹۱۹ء

مخدومی ، السلام علیکم

والا نامہ کئی دنوں سے آیا رکھا ہے ، مگر میں لاہور میں نہ تھا ، اس واسطے جواب میں تاخیر ہوئی ، معاف فرمائیے گا ۔

یہ شعر ''گلشن راز''[1] کا نہیں ہو سکتا ۔ اس کی بحر اور ہے :

''یقیں داند کہ ہستی جز یکے نیست''

انشاء اللہ 'معارف' کے لیے کچھ نہ کچھ لکھوں گا ۔ کئی ماہ کے بعد صرف تین شعر لکھے تھے ۔ 'نقیب'[2] کا عرصے سے تقاضا تھا ۔ اس کے لیے بھیج دیے ۔

میں تو اپنے اشعار کو چنداں وقعت نہیں دیتا لیکن جب ایڈیٹر 'معارف' ان کے لیے تقاضا کرتے ہیں تو شبہ ہوتا ہے کہ شاید ایسا ہی کچھ ہو ۔

حیدرآباد کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں ۔ افواہاً میں نے کئی دفعہ سنا ہے کہ وہاں اقبال کا تذکرہ ہے ، مگر مجھ تک کبھی کوئی باقاعدہ اطلاع نہیں آئی ، نہ میں نے خود کوئی درخواست آج تک کی ۔

مخلص ، محمد اقبال ، لاہور

۱۔ مثنوی شیخ محمود شبستری (م ۷۲۰ھ/۱۳۲۱ء) ۔

۲۔ وحید احمد کی ادارت میں ۱۹۱۹ء میں بدایوں سے جاری ہوا اور کچھ عرصے بعد بند ہو گیا ۔ ۱۹۲۱ء میں دوبارہ جاری ہوا ۔

۱۷

لاہور

۲۷ ستمبر ۱۹۱۹ع

مخدومی ، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

دوسرے صفحے پر چند اشعار 'معارف' کے لیے لکھتا ہوں ۔ مدت سے یہ بات میرے دل میں کھٹک رہی تھی ۔ گزشتہ رات زکام کی وجہ سے سو نہ سکا ۔ یہ تاثر ایک چھوٹی سی تضمین کی صورت میں منتقل ہو گیا ۔ دردِ سر نے زیادہ شعر نہ لکھنے دیے اور نہ طبیعت پر زیادہ زور دے سکا ۔ معلوم نہیں اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ۔ واقعات صاف اور نمایاں ہیں مگر ہندوستان کے سادہ لوح مسلمان نہیں سمجھتے اور لندن کے شیعوں[1] کے اشارے پر ناچتے چلے جاتے ہیں ۔ افسوس مفصّل عرض نہیں کر سکتا ہے کہ زمانہ نازک ہے ۔ بہرحال اگر یہ اشعار آپ کو پسند نہ ہوں یا رسالہ 'معارف' کے لیے آپ انھیں موزوں نہ تصور فرمائیں تو واپس بھیج دیجیے ۔

مسئلۂ تصویر پر آپ نے خوب لکھا اور اصولِ تشریعی واضح

۱۔ اشارہ ہزہائی نس آغا خان کی طرف ہے ۔ مجلسِ خلافت کی بنیاد اس طرح پڑی تھی : یعنی یہ کہ آغا خان نے منشی مشیر حسین صاحب قدوائی مرحوم بیرسٹر کو آمادہ کیا اور انھوں نے مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کو لکھ کر آمادہ کیا ۔ (س)

کر کے کئی اور مسائل کو بالکنایہ حل کر دیا ۔ للہ درک ۔
اس خط کو پرائیویٹ تصور فرمائیے ۔

بہت آزمایا ہے غیروں کو تو نے
مگر آج ہے وقتِ خویش آزمائی

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا ؟
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

''مرا از شکستن چنیں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی''

عنوان ان اشعار کا آپ خود تجویز کر لیں ۔ اصل فارسی شعر میں ''دیگراں'' کی جگہ ''ناکساں'' ہے ۔ میں نے یہ لفظی تغیّر ارادۃً کیا ہے ۔

مخلص ، محمد اقبال

۱۸

لاہور
۱۰ ۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء
مخدومی ، السلام علیکم

نوازش نامہ ملا ۔ عنوان جو آپ نے تجویز فرمایا ہے ، ٹھیک ہے ۔ تبصرے کے متعلق میں بھی یہی مشورہ دوں گا کہ میرا مجموعہ

شائع ہو لے تو لکھیے - فی الحال میں ایک مغربی شاعر کے دیوان کا جواب[1] لکھ رہا ہوں جس کا قریباً نصف حصہ لکھا جا چکا ہے - کچھ نظمیں فارسی میں ہوں گی ، کچھ اُردو میں - کلام کا بہت سا حصہ نظرثانی کا محتاج ہے - لیکن اور مشاغل اتنی فرصت نہیں چھوڑتے کہ ادھر توجہ کر سکوں ، تاہم جو کچھ ممکن ہے کرتا ہوں - شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا ، کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں - مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس - اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں اُن کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں - کیا عجب کہ آیندہ نسلیں مجھے شاعر تصوّر نہ کریں ؛ اس واسطے کہ آرٹ (فن) غایت درجے کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لیے ممکن نہیں - جرمنی کے دو بڑے شاعر بیرسٹر تھے ؛ یعنی گوئٹے[2] اور اوہلنڈ - گوئٹے تھوڑے دن پریکٹس کے بعد ویمر کی ریاست کا تعلیمی مشیر بن گیا اور اس طرح فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کا اُسے پورا موقع مل گیا - اوہلنڈ تمام عمر مقدمات پر بحث کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑی نظمیں لکھ سکا اور وہ کمال پورے طور پر نشو و نما نہ پا سکا جو اُس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا - غرض یہ کہ موجودہ حالات میں میرے افکار اس قابل نہیں کہ اُن کی تنقید کے لیے سید سلیمان کا دل و دماغ صرف ہو ، لیکن اگر احباب تبصرے پر مصر ہیں تو یہی

۱- پیامِ مشرق -

۲- (م ۱۸۳۲ء) -

بہتر ہے کہ مجموعے[1] کا انتظار کیا جائے ۔ اس کے علاوہ میں اپنے دل و دماغ کی سرگزشت بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں اور یہ سرگزشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لیے نہایت ضروری ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں ، اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہوگا ۔

کاش ''یاجوج ماجوج'' پر آپ کوئی مضمون لکھتے ۔ یہ امر تحقیق کا محتاج ہے ۔

زیادہ کیا عرض کروں ، امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔ والسلام

مخلص ، محمد اقبال

۱۹

لاہور

۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء

مخدومی ، السلام علیکم

کئی دنوں سے آپ کو خط لکھنے کا قصد کر رہا تھا ۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ مؤکلین وکلاء کے پاس جب مقدمات کی پیشی کے لیے آتے ہیں تو ان میں سے بعض پھل پھول یا مٹھائی کی صورت میں ہدیہ لے آتے ہیں ۔ یہ ہدایا فیس مقررہ کے علاوہ ہوتے ہیں اور وہ لوگ اپنی خوشی سے لاتے ہیں ۔ کیا یہ مال مسلمان کے لیے حلال ہے ؟

۱۔ 'بانگِ درا' کی طرف اشارہ ہے ۔

مولانا ابوالکلام کا تذکرہ[1] آپ کی نظر سے گزرا ہوگا - بہت دلچسپ کتاب ہے مگر دیباچے میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ ''اقبال کی مثنویاں تحریکِ 'الہلال' ہی کی آوازِ بازگشت ہیں[2] -''

۱- مولانا آزاد کی خود نوشت جس میں تجدید و احیائے دین کی تاریخ بیان کر دی گئی ہے - مولانا جنگِ عظیم اول میں رانچی میں نظر بند تھے - اس زمانے میں مولوی فضل الدین مرزا نے مولانا کی رائے اور اجازت کے بغیر ''تذکرہ'' کا پہلا حصہ شائع کیا - مولانا پوری کتاب ایک ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے - دوسرا حصہ مولوی فضل الدین مرزا صاحب کے پاس تھا اور پھر اُس کا پتا نہ چلا -

مولانا آزاد ، عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں :

''. . . تذکرہ کوئی ایسی چیز نہ تھی جو خصوصیت کے ساتھ شائع کی جاتی - ایک صاحب نے بطور خود شائع کر دیا - بوجوہ اس کی اشاعت میرے لیے خوش آیند نہ ہوئی -'' (تبرکاتِ آزاد ، ص ۱۰۱) -

۲- سید سلیمان ندوی صاحب نے مولانا آزاد کو اس طرف توجہ دلائی تو مولانا آزادؒ نے ۲ جنوری ۱۹۲۰ء کے خط میں یہ صورتِ حالات پیش کی :

''ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بے جا نہیں - یہ نہایت ہی لغو اور سبک بات ہے کہ فلاں نے فلاں بات فلاں کے اثر سے لکھی اور فلاں کے خیال میں یوں تبدیلی ہوئی - لیکن لوگوں کا پیمانۂ نظر یہی باتیں ہیں تو کیا کیا جائے - دراصل اس کم بخت 'تذکرہ' کی ساری باتیں میرے لیے تکلیف دہ ہوئیں - مسٹر فضل دین نے یہ مقدمہ لکھ کر نظرثانی کے لیے بھیجا تھا - میں نے واپس نہیں بھیجا اس لیے کہ وہ موجودہ حالت میں کتاب کو پہلا حصہ کر کے شائع کرنا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

شاید اُن کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں ، اُن کو برابر ۱۹۰۷ع سے ظاہر کر رہا ہوں ۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم و نثر و انگریزی و اُردو موجود ہیں جو غالباً مولوی صاحب کے پیشِ نظر نہ تھیں ۔ بہر حال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ اُنھوں نے ایسا لکھا ۔ مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے ، نہ نام آوری ۔ البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ اُن کے خیال میں اقبال تحریکِ 'الہلال' سے پہلے مسلمان نہ تھا ۔ تحریکِ 'الہلال' نے اُسے مسلمان کیا ۔ اُن کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے ، ممکن ہے اُن کا مقصود یہ نہ ہو ۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور اُن کی تحریک سے ہمدردی ، مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لیے یہ ضرور نہیں کہ اوروں کی دلآزاری کی جائے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے سنے گئے اُن میں اور مثنویوں میں زمین و آسمان کا فرق

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

چاہیئے تھے اور میں مُصر تھا کہ ایک ہی مرتبہ میں پوری کتاب شائع کر دی جائے ۔ صرف اتنا ٹکڑا حد درجہ ضمنی مطولات و عدمِ انضباط کی وجہ سے نہایت مکروہ ہوگا ۔ خیال کیا کہ مقدمے کا واپس نہ کرنا اشاعت میں روک ہوگا لیکن اُنھوں نے بجنسہ چھاپ کر ، جلد باندھ کر ، یکایک ایک نسخہ بھیج دیا اور ان ساری باتوں کو وہ مزاح سمجھتے رہے ۔ علاوہ ڈاکٹر اقبال وغیرہ والے ٹکڑے کے ، پورا مقدمہ طرزِ تحریر و استدلال وغیرہ کے لحاظ سے بھی بالکل لغو ہے ۔"

(تبرکاتِ آزاد ، ص ۱۵۷)

ہے۔" معلوم نہیں انھوں نے کیا سنا تھا، اور سنی سنائی بات پر اعتبار کر کے ایسا جملہ لکھنا جس کے کئی معنی ہو سکتے ہوں، کسی طرح اُن لوگوں کے شایانِ شان نہیں جو اصلاح کے علم بردار ہوں۔ مجھے معلوم نہیں مولوی فضل الدین صاحب کہاں ہیں ورنہ یہ مؤخرالذکر شکایت براہِ راست اُن سے کرتا۔ اگر آپ سے اُن کی ملاقات ہو تو میری شکایت اُن تک پہنچائیے۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

آپ کا خادم، محمد اقبال، لاہور

۲۰

لاہور

۱۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء

مخدومی، السلام علیکم

مراجعت[1] مع الخیر مبارک!

آپ نے بڑا کام کیا ہے جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گزاری کی صورت میں مل رہا ہے اور دربارِ نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا۔ وزراے انگلستان کا جواب وہی ہے جو اُن حالات میں ہمیشہ دیا گیا ہے۔

"أنؤمن لبشرين مثلنا و قومهما لنا عابدون[2]۔"

۱۔ مکتوب الیہ "وفدِ خلافت" میں یورپ" گئے تھے۔
۲۔ (مومنون : ۴۷) یہ قرآن پاک کی آیت اُس موقع کی ہے جب فرعون

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

تاہم مجھے یقین ہے کہ ہندی وفد کا سفرِ یورپ بڑے اہم نتائج پیدا کرے گا۔

امید کہ آپ کی صحت اچھی ہوگی۔ والسلام

مخلص، محمد اقبال

۲۱

لاہور

۲۳ دسمبر ۱۹۲۰ء

مخدومی، السلام علیکم

"سیرتِ عائشہؓ" کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ یہ ہدیۂ سلیمانی نہیں سرمۂ سلیمانی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا۔ خدا تعالیٰ جزائے خیر دے۔

یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ 'حمیرا'[۱] والی سب احادیث موضوعات میں ہیں۔ کیا "کلمینی یا حمیرا" بھی موضوع ہے؟ کمال[۲]

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

نے حضرتِ موسیٰ اور حضرتِ ہارون علیہما السلام پر ایمان لانے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ یہ دونوں عام بشر تھے اور اُن کی قوم فرعون کی غلام رعایا میں تھی۔ اس آیت کا ترجمہ بھی یہی ہے (س)

۱- بعض روایتوں میں حضرت عائشہؓ کا لقب حمیرا (گوری) آیا ہے۔ محدثین کے نزدیک یہ روایات سنداً درست نہیں (سیرتِ عائشہ ص : ۵ حاشیہ)۔

۲- کمال خجندی (م ۸۰۰ھ/۱۳۹۸ء)۔

کا شعر کیا مزے کا ہے :

این تصوف ہائے من در شعرِ من
کلمینی یا حمیرائے من است

زیادہ کیا عرض کروں ، امید کہ مزاج بخیر ہوگا -

مخلص ، محمد اقبال

۲۲

لاہور

۵ - اکتوبر ۱۹۲۱ع

مخدومی ، تسلیم

ستمبر کا 'معارف' ابھی نظر سے گزرا ہے - اس میں مسٹر ڈکنسن کے ریویو (اسرارِ خودی) کا ترجمہ آپ نے شائع کیا ہے - ترجمہ مذکور کا ایک فقرہ یہ ہے :

"اقبال ان تمام فلسفوں کے دشمن ہیں جو شئے واجب الوجود کو تسلیم کرتے ہیں -" (صفحہ ۲۱۳)

اگر آپ کے پاس رسالہ نیشن (Nation) موجود ہو جس میں انگریزی ریویو شائع ہوا تھا تو میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں - مہربانی کر کے ایک آدھ روز کے لیے بھیج دیجیے مجھے ایسا خیال ہے کہ غالباً مذکورہ بالا فقرہ اس ریویو میں نہیں ہے یا اس کی جگہ کچھ اور ہے - مقصود یہ معلوم کرنا ہے کہ کہیں ترجمے میں سہو تو نہیں ہوگیا - کیا حکمائے صوفیہ اسلام میں سے کسی نے زمان و مکان کی حقیقت پر بھی بحث کی ہے ؟

اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔ والسلام

مخلص ، محمد اقبال

مولوی عبدالماجد[۱] صاحب کا پتہ معلوم نہ تھا اس واسطے آپ کو زحمت دی گئی ۔
محمد اقبال

۲۳

مخدومی ، السلام علیکم

پوسٹ کارڈ ابھی ملا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔ کیا کتب خانۂ بانکی پور سے کتاب عاریۃً مل سکتی ہے ؟ میں اس کتاب کے دیکھنے کا مدت سے خواہش مند ہوں ۔ انگلستان اور یورپ میں تو کتابیں عاریۃً مل سکتی ہیں ۔ معلوم نہیں اس لائبریری کا کیا قاعدہ ہے ۔ شاید پنجاب یونیورسٹی کے معرفت لکھنے سے مل جائے ۔ غالباً قلمی نسخہ ہوگا ۔ والسلام

مخلص ، محمد اقبال ، لاہور

۲۸ نومبر ۱۹۲۱ع

۲۴

لاہور

۲۰ ۔ اپریل ۱۹۲۲ع

مخدومی ، السلام علیکم

ایک عرصے سے آپ کو خط لکھنے کا قصد کر رہا تھا ۔ دو

۱۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ، مدیر ''صدق جدید'' (لکھنؤ) اُن دنوں ''معارف'' کے مدیر معاون تھے ۔

باتیں دریافت طلب ہیں :

(۱) متکلمین میں سے بعض نے علمِ مناظر و مرایا کے رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا تعالیٰ کی رؤیت ممکن ہے ۔ یہ بحث کہاں ملے گی ؟ میں اس مضمون کو دیکھنا چاہتا ہوں ۔

(۲) مرزا غالب[1] کے اس شعر کا مفہوم آپ کے نزدیک کیا ہے :

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود رحمۃً للعالمینے ہم بود

حال کے ہیئت دان کہتے ہیں کہ بعض سیاروں میں انسان یا انسانوں سے اعلیٰ تر مخلوق کی آبادی ممکن ہے ۔ اگر ایسا ہو تو رحمۃً للعالمین کا ظہور وہاں بھی ضروری[2] ہے ۔ اس صورت میں کم ازکم مہدیت کے لیے تناسخ یا بُروز لازم آتا ہے ۔ شیخِ اشراق[3] تناسخ کے ایک شکل میں قائل تھے ۔ اُن کے اس عقیدے کی وجہ یہی تو نہ تھی ؟[4]

۱۔ اسد اللہ خان غالب (م ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء/۳ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) ۔

۲۔ اس معنی کا ایک اثر بھی تفسیروں میں مروی ہے جو اثرِ ابن عباس کے نام سے ہے ۔ اس اثر کی تاویل و تشریح میں مولانا (محمد) قاسم (نانوتوی) صاحب کا رسالہ ''تحذیر الناس فی اثر ابن عباس'' اور مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی کا ایک مضمون ہے جو اس بحث کے ضمن میں دیکھنے کے قابل ہے ۔ (س)

۳۔ شیخ شہاب الدین (مقتول ۵۸۵ھ/۱۱۸۹ء) ۔

۴۔ یہ وجہ نہیں ۔ شیخِ اشراق فلسفے سے متاثر تھے اور وہاں سے یہ خیال اُن تک پہنچا تھا ۔ دیکھیے ''شرح کلمۃ الاشراق'' مقالہ خامسہ ۔ (س)

نیں نقرس کی وجہ سے دو ماہ کے قریب صاحبِ فراش رہا ۔
اب کچھ افاقہ ہوا ہے ۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔ والسلام
مخلص ، محمد اقبال ، لاہور

۲۵

لاہور

۱۴ مئی ۱۹۲۲ء

مخدومی ، السلام علیکم

والا نامہ ملا جس کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔

رؤیتِ باری کے متعلق جو استفسار میں نے آپ سے کیا تھا ، اُس کا مقصود فلسفیانہ تحقیقات نہ تھی ۔ خیال تھا کہ شاید اس بحث میں کوئی بات ایسی نکل آئے جس سے آئن سٹائن[۱] کے انقلاب انگیز نظریۂ نور پر کچھ روشنی پڑے ۔ اس خیال کو ابنِ رشد[۲] کے ایک رسالے سے تقویت ہوئی جس میں اُنھوں نے ابوالمعالی کے رسالے سے ایک فقرہ اقتباس کیا ہے ۔ ابوالمعالی کا خیال آئن سٹائن سے بہت ملتا جلتا ہے ، گو مقدّم الذکر کے ہاں یہ بات محض ایک قیاس ہے اور مؤخّرالذکر نے اُسے علم ریاضی کی رُو سے ثابت کردیا ہے ۔

اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے ، تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے اور جس کو آپ نے آیتِ شریفہ کے حوالے سے بیان فرمایا ہے ۔ خلافت پر جو مضامین آپ نے لکھے ،

۱۔ نظریۂ اضافیت کا خالق البرٹ آئن سٹائن ۔
۲۔ مشہور مسلم فلسفی (م ۵۹۴ھ/۱۱۹۸ء) ۔

نہایت قابلِ قدر ہیں ۔ ان سب کو ایک علیحدہ رسالے کی صورت میں شائع ہونا چاہیے ۔

نظم ''خضرِ راہ'' جو انجمن کے سالانہ جلسے میں پڑھی تھی ، ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع ہوگئی تھی ۔ میں آج دریافت کراؤں گا ۔ اگر کوئی کاپی اس کی موجود ہے تو خدمتِ والا میں ارسال کرا دوں گا ۔ ساری نظم کا اب چھپنا تو ٹھیک نہیں اور نہ اس قدر گنجائش 'معارف' میں ہوگی لیکن اگر کوئی بند آپ کو پسند آ جائے تو اُسے چھاپ دیجیے ۔ زیادہ کیا عرض کروں ۔ اُمید کہ مزاج بخیر ہوگا ۔ گوئٹے (شاعرِ جرمنی) کے مشرقی دیوان کے جواب میں میں نے ایک مجموعہ فارسی اشعار کا لکھا ہے ، عنقریب شائع ہوگا ۔ اس کے دیباچے میں یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ فارسی لٹریچر نے جرمن لٹریچر پر کیا اثر کیا ہے ۔ والسلام

مخلص محمد اقبال

۲۶

لاہور

۲۹ مئی ۱۹۲۲ء

عید مبارک باشد !

مخدومی ، السلام علیکم

میں آپ کو خط لکھنے والا تھا کہ مفتی عالم جان[1] کے حالات

---

(۱) مفتی عالم جان مسلمانانِ روس کے عظیم مصلح تھے ۔ وہ ۱۸۵۶ء میں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

'معارف' میں شائع کیے جائیں ۔ 'مسلم اسٹینڈرڈ' لندن نے اُن کے کچھ حالات شائع کیے تھے ، آج کے 'معارف' میں میری آرزو سے بڑھ کر مضمون لکھا گیا ، جزاک اللہ ۔ 'معارف' کا ایڈیٹر صاحب کشف نہ ہوگا تو اور کون ہوگا ؟ حال کے روسی علماء کے بعض

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

پیدا ہوئے ۔ بخارا میں تعلیم حاصل کی ۔ فارغ التحصیل ہوئے تو قازان میں جدید طرز کا ایک مدرسہ قائم کیا ۔ اس مدرسے نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی اور ۱۸۸۰ء میں قازان کی اسلامی یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گیا ۔ اس جدید طرز کی مذہبی درس گاہ نے روسی مسلمانوں کے انقلاب و ترقی میں اہم کردار ادا کیا ۔ اس دینی درسگاہ کے ساتھ سائنس کالج کا اضافہ بھی کر دیا گیا ۔

زار کی حکومت نے مفتی صاحب کو قید کر کے شمالی روس میں بھیج دیا ۔ سلطان عبدالحمید نے احتجاج کیا تو زار نے اُنھیں ترکی منتقل کر دیا جہاں وہ ۱۹۱۱ء تک مقیم رہے اور یہاں سے روسی مسلمانوں کی راہنمائی کرتے رہے ۔

۱۹۱۱ء میں روس آئے تو تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ سیاسی جد و جہد شروع کی ۔ ''ڈیموکریٹک پارٹی'' کے نام سے سیاسی تنظیم قائم کی ۔ اس کے ذریعے تاتاری مسلمانوں میں جمہوری خیالات نے مقبولیت حاصل کی اور ''آل رشیا مسلم ڈیموکریٹک پارٹی'' قائم ہوئی ۔ ۱۹۱۷ء میں اشتراکی انقلاب برپا ہوا تو مفتی صاحب نے اس کا خیرمقدم کیا ۔ مسلمانوں نے اُنھیں مفتی اعظم کے عہدے کے لیے تجویز کیا اور اشتراکی حکومت نے عوام کے مطالبے کو تسلیم کر لیا ۔ لیکن اشتراکی حکومت کے ساتھ اُن کی نہ چل سکی اور قید کر دیے گئے ۔ آزاد ہونے کے تھوڑے عرصے بعد ماسکو میں ۱۹۲۱ء میں وفات پائی (ملخص از ''معارف'' ، مئی ۱۹۲۲ء) ۔

تصانیفِ اسلام کے متعلق دستیاب ہو جائیں تو اُن کا ترجمہ ہندوستان میں شائع ہونا چاہیے -

''خضرِ راہ'' کے متعلق جو نوٹ آپ نے لکھا ، اس کا شکریہ قبول فرمائیے -

جوشِ بیان کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ، صحیح ہے - مگر یہ نقص اس نظم کے لیے ضروری تھا (کم از کم میرے خیال میں) - جنابِ خضر کی پختہ کاری ، اُن کا تجربہ اور واقعات و حوادثِ عالم پر اُن کی نظر ، ان سب باتوں کے علاوہ اُن کا اندازِ طبیعت جو سورۂ کہف سے معلوم ہوتا ہے ، اس بات کا مقتضی تھا کہ جوش اور تخیّل کو اُن کے ارشادات میں کم دخل ہو - اس نظم کے بعض بند میں نے خود نکال دیے اور محض اس وجہ سے کہ اُن کا جوشِ بیان بہت بڑھا ہوا تھا اور جناب خضر کے اندازِ طبیعت سے موافقت نہ رکھتا تھا - یہ بند اب کسی اَور نظم کا حصہ بن جائیں گے -

اُمید کہ جناب کا مزاج بخیر ہوگا - والسلام

مخلص ، محمد اقبال

۲۷

شملہ ، نوبہار

۳- اگست ۱۹۲۲ء

مخدومی ، السلام علیکم

میں کچھ دنوں کے لیے شملہ میں قیام پذیر ہوں - نقرس کے

دورے کی وجہ سے صحت اچھی نہیں رہی ۔

مردانِ خدا ، خدا نباشند
لیکن ز خدا جدا نباشند

کس کا شعر ہے ؟ ایک امر کے لیے اس کی تحقیق ضروری ہے ۔ ممکن ہے آپ کی نظر سے کسی تذکرے میں یہ شعر گزرا ہو ۔ عام طور پر مشہور ہے ۔ میں چند روز اور شملہ میں ہوں ۔ اگر آپ جلد جواب دیں تو مندرجہ بالا پتے پر خط لکھیں اور (اگر) کچھ دنوں کے بعد خط لکھنا ہو تو لاہور کے پتے پر تحریر فرمائیں ۔

امید کہ جناب کا مزاج بخیر ہوگا ۔ والسلام

مخلص ، محمد اقبال بیرسٹر ، لاہور

۲۸

لاہور

۲۲۔ اگست ۱۹۲۲ء

مخدومی جناب مولانا ، السلام علیکم

نوازش نامہ ابھی ملا ہے جس کے لیے بہت شکرگزار ہوں ۔ جتنی آگاہی آپ نے دے دی ہے وہ اگر زمانہ فرصت دے تو باقی عمر کے لیے کافی ہے ۔

مولانا حکیم برکات احمد صاحب بہاری ثم ٹونکی[1] کا رسالہ

۱۔ (م یکم ربیع الاول ۱۳۴۷ھ/ستمبر ۱۹۲۸ء) ، مولانا عبدالحق خیرآبادی کے شاگرد تھے ۔

"تحقیقِ زمان[1]" مطبوعہ ہے یا قلمی؟ اگر قلمی ہے تو کہاں سے عاریتاً ملے گا؟ علیٰ ہذا القیاس مولانا شاہ اسمٰعیل شہید[2] کی "عبقات[3]"، قاضی محب اللہ[4] کی "جواہر الفرد" اور حافظ امان اللہ بنارسی[5] کی تمام تصانیف کہاں سے دستیاب ہوں گی؟

زمان و مکان و حرکت کی بحث اس وقت فلسفے اور سائنس کے مباحث میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ میری ایک مدت سے خواہش ہے کہ اسلامی حکما و صوفیہ کے نقطۂ نگاہ سے یورپ کو روشناس

۱۔ رسالے کا نام "اتقان العرفان فی ماہیت الزمان" ہے۔ یہ ۱۳۳۷ھ (۱۹-۱۹۱۸ء) میں شاہی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس کا اُردو ترجمہ مع تعلیقات مولانا محمود احمد برکاتی کے قلم سے اقبال اکیڈمی کراچی نے شائع کیا ہے۔

۲۔ شہیدِ بالاکوٹ (ش ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء)۔

۳۔ عربی زبان میں تصوف کے موضوع پر ایک اہم تالیف، اس کا اُردو ترجمہ مولانا مناظر احسن گیلانی کے قلم سے 'لجنۃ العلمیہ' حیدر آباد (دکن) سے شائع ہو چکا ہے۔

اُردو ترجمہ کے مقدمہ نگار ضیاءالدین احمد شکیب نے ایک موقع پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "عبقات اپنی ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے علامہ اقبال کے خطبات سے بہت قریب ہے اور یہ کہ شاہ صاحب شہید کی تشکیل الٰہیات، مغربی تعلیم یافتہ حضرات کے لیے اُس قدر دلچسپ اور سود مند ہوگی جس قدر کہ اقبال کے خطبات ہیں"

۴۔ عہدِ عالمگیری کے بلند پایہ فلسفی اور فقیہ (م ۱۱۱۹ھ/۰۸-۱۷۰۷ء)۔

۵۔ عہدِ عالمگیر میں لکھنؤ کے عہدۂ صدارت پر فائز تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ مسئلۂ حدوثِ دہر سے متعلق ایک محاکمہ تحریر کیا تھا۔ ۱۱۳۳ھ/۲۱-۱۷۲۰ء میں انتقال ہوا (تذکرہ علمائے ہند)۔

کروایا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا بہت اچھا اثر ہوگا۔

میرے لیکچر[1] آکسفورڈ یونیورسٹی چھاپ رہی ہے۔ اردو ترجمہ[2] نیازی صاحب نے ختم کر لیا ہے۔ اس کی طباعت بھی عنقریب شروع ہوگی۔

جن کتابوں کا آپ نے اپنے والا نامے میں ذکر فرمایا ہے، کیا آپ کے کتب خانۂ دارالمصنفین میں موجود ہیں؟ اگر ہوں تو میں چند روز کے لیے وہیں حاضر ہو جاؤں اور آپ کی مدد سے اُن میں سے بعض کو دیکھ سکوں۔

پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں ان میں سے بعض موجود ہیں مگر سب نہیں۔ اس کے علاوہ یہاں علمی شغف رکھنے والے علما بھی موجود نہیں ہیں جن سے وقتاً فوقتاً استفادہ کیا جائے۔ فی الحال میں مولوی نور الحق[3] صاحب کی مدد سے ''مباحث مشرقیہ''[4] دیکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد ''شرح مواقف''[5] دیکھنے کا قصد ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں، امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ جو

۱۔ *Reconstruction of Religions Thought in Islam*

۲۔ ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

۳۔ برادر ڈاکٹر غلام جیلانی برق، پروفیسر اورینٹل کالج لاہور (م ۱۹۵۰ء)۔

۴۔ طبیعیات و الٰہیات میں امام رازی کی تصنیف (س)۔

۵۔ علم کلام میں قاضی عضد الدین ایجی (م ٧٥٦ھ) نے ''مواقف'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس کی شرح سید شریف جرجانی (م ٦ ربیع الآخر ٨١٦ھ/١٤١٣ء) نے لکھی۔ مدارسِ عربیہ میں نصابی کتاب ہے۔

زحمت میں کبھی کبھی آپ کو دیتا ہوں ، اس کے لیے معاف فرما دیا کریں ۔ حضرت ابنِ عربی[1] کے بحثِ زمان کا ملخّص اگر عطا ہو جائے تو بہت عنایت ہوگی ۔ آپ کے ملخّص کی روشنی میں کتاب میں خود پڑھوں گا ۔ والسلام

مخلص ، محمد اقبال

۲۹

لاہور

۲۳ جنوری ۱۹۲۴ء

مخدومی ، السلام علیکم

رسالہ ''ذخیرۃ الدینیہ'' جاوا سے نکلنا شروع ہوا ہے ۔ آپ کی خدمت میں بھی پہنچا ہوگا ۔ ایڈیٹر واقف کار معلوم ہوتا ہے اور مضامین اچھے لکھتا ہے ۔ ہر مہینے حدیثِ نبوی کے متعلق کچھ نہ کچھ اس میں ضرور ہوتا ہے ۔ گذشتہ ماہ کے پرچے میں وہ لکھتے ہیں کہ حدیث ''خلیلی فی ھذہ الامۃ اویس القرنی'' موضوع ہے ۔ اور امام مالک[2] کے نزدیک اویس[3] کا کوئی تاریخی وجود ہی نہیں ہے ۔ آپ حضرت اویس اور اُن تمام صوفی روایات کے متعلق ، جو اُن سے منسوب ہیں ، کیا خیال رکھتے ہیں ؟ اگر حضرت امام مالک کی تحقیق[4]

۱۔ صاحبِ فتوحاتِ مکّیہ ، مشہور وجودی فلسفی (م ٦۳۸ھ/۱۲۴۰ء)

۲۔ مؤطا (مجموعۂ احادیث) کے مؤلف (م ۱۷۹ھ/۷۹۸ء) ۔

۳۔ مشہور تابعی (م ۳۸ھ/٦۵۹ء) ۔

۴۔ اصابہ ابن حجر میں ہے : ''قال ابن عدی لیس لہ روایۃ لکن کان ینکر وجودہ'' ۔ اس کو نقل کر کے حافظ ابنِ حجر نے اُن کے وجود کی اثباتی روایتیں لکھی ہیں (س) ۔

زیر نظر ہو تو از راہِ عنایت حوالے سے آگاہ فرمائیے گا۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

مخلص، محمد اقبال، لاہور

۳۰

لاہور

یکم فروری ۱۹۲۴ء

مخدومی، السلام علیکم

نوازش نامہ معلومات سے لبریز ہے۔ نہایت شکرگزار ہوں۔

میں نے چند نظمیں فارسی میں لکھی تھیں جو ''پیامِ مشرق'' کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کر دی گئیں۔ اُن ہی نظموں میں سے ایک آپ کی خدمت میں ارسال کی گئی تھی۔ ایک جامعۂ ملیّہ علی گڑھ کے لیے اور ایک 'علی گڑھ' منتھلی کے لیے بھیجی گئی۔ اور کسی جگہ کوئی نظم میں نے نہیں بھیجی۔ 'معارف' مجھے خاص طور پر محبوب ہے اور بالخصوص آپ کے مضامین کے لیے کہ آپ کی نثر معانی سے معمور ہونے کے علاوہ لٹریری خوبیوں سے بھی مالا مال ہوتی ہے۔

مولانا گرامی کی غزل میں سن چکا ہوں۔ اس کا ایک شعر مجھے خاص طور پر پسند آیا:

فقر را ترکمانئے هم هست

اس شعر پر میں نے تضمین بھی کی تھی مگر ''پیامِ مشرق'' میں اس واسطے داخل نہ کی کہ اس کے اشعار کی بندش کچھ بھی پسند

نہ آئی ۔ اگر آپ کو پسند ہو تو مجھے اشاعت میں کوئی عذر نہیں ۔
عرض کرتا ہوں :

سخنے رانـدۂ کہ جز قرشی
بہ سرِ مسندِ نبی نہ نشست

درس گیر از گرامیٔ ہمہ درد
کہ برید از خود و باو پیوست

رمزِ تــرکِ خلافتِ عــربی
گفت آں مے گسارِ بــزمِ الست

ماہ را بر فلک دونیم کند
فقر را تــرکمانئے ہم ہست[1]

لفظ 'نشانی' کلاسیکل فارسی میں تو آتا ہے ، جدید فارسی کا حال مجھے معلوم نہیں ۔ ''بہارِ عجم'' ملاحظہ فرمائیے ۔

مسلمانوں نے منطقِ استقرائی پر جو کچھ لکھا ہے اور جو جو اضافے انھوں نے یونانیوں کی منطق پر کیے ہیں ، اس کے متعلق میں کچھ تحقیق کر رہا ہوں ۔

میں آپ کا نہایت شکرگزار ہوں گا اگر آپ از راہِ عنایت اپنی وسیع معلومات سے مجھے مستفیض فرمائیں ۔ کم از کم ان کتابوں کے نام تحریر

۱۔ علامہ کی یہ تضمین ''معارف'' میں مندرجہ ذیل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی :

''یہ سچ ہے کہ 'پیامِ مشرق' کے ساز میں یہ لحن شیرازی کچھ زیادہ سامعہ نواز نہ ہو تو بھی اس سے الگ اقبال کی صدا کا ہر حرف گوشوارۂ حقیقت ہے'' (معارف ، فروری ۱۹۲۳ع) ۔

فرمائیے جن کو پڑھنا ضروری ہے - جرمن زبان میں کچھ مسالہ اس کے لیے چھپے اور چند کتابیں اسلامی حکما پر حال ہی میں شائع ہوئی ہیں جو میں نے پنجاب یونیورسٹی کے لیے خرید لی تھیں - عربی و فارسی کتب سے آپ آگاہ فرمائیں مگر کتابیں ایسی ہوں جو دستیاب ہو سکتی ہوں - اُن کے ناموں پر نشان کر دیجیے گا - 'قیاس' پر اعتراض غالباً سب سے پہلے[1] امام رازی[2] نے کیا تھا - امام غزالی[3] ، ابنِ تیمیہ[4] اور شاید شیخ سہروردی مقتول[5] نے بھی اس مضمون پر لکھا ہے - مؤخرالذکر کی تحقیق زمانۂ حال کے خیالات کے بہت قریب ہے - امید کہ مزاج بخیر ہوگا -

مخلص ، محمد اقبال

۳۱

لاہور

یکم مئی ۱۹۲۳ء

مخدومی : السلام علیکم

کیا روسی مسلمانوں میں بھی ابن تیمیہؒ اور محمد بن عبدالوہاب[6]

۱- سب سے پہلے ابو البرکات بغدادی نے کیا تھا جن کی کتاب ''المعتبر'' حیدرآباد سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے (سید سلیمان ندوی) -

۲- صاحبِ مباحثِ مشرقیہ (م ۶۱۹ھ/۱۲۲۲ء) -

۳- (م ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء) -

۴- (م ۷۲۸ھ/۱۳۲۸ء) -

۵- شیخِ اشراق (م ۵۸۵ھ/۱۱۸۹ء) -

۶- نجد و حجاز کی تحریکِ توحید و اصلاح کے بانی (م شوال یا ذی قعدہ ۱۲۰۶ھ/جون یا جولائی ۱۷۹۲ء) -

نجدی کے حالات کی اشاعت ہوئی تھی ؟ اس کے متعلق آگاہی کی ضرورت ہے ۔ مفتی عالم جان[1] ، جن کا حال میں انتقال ہوگیا ہے ، ان کی تحریک کی اصل غایت کیا تھی ؟ کیا یہ محض تعلیمی تحریک تھی یا اس کا مقصود ایک مذہبی انقلاب بھی تھا ؟

تکلیف دہی کے لیے معافی چاہتا ہوں اور یہ بھی التماس کرتا ہوں کہ اس عریضے کا جواب جہاں تک ممکن ہو جلد دیا جائے ۔

والسلام

مخلص ، محمد اقبال

۳۲

لاہور

۵ جولائی ۱۹۲۴ء

مخدومی ، السلام علیکم

''پیامِ مشرق'' پر جو نوٹ آپ نے 'معارف' میں لکھا ہے اس کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔

پروفیسر نکلسن[2] کا خط بھی آیا ہے ۔ انھوں نے اسے بہت پسند کیا ہے اور غالباً اس کا ترجمہ بھی کریں گے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب جدید اورینجنل خیالات سے مملو ہے اور گوئٹے کے دیوانِ مغربی کا قابلِ تحسین جواب ہے ۔ مگر میرے لیے آپ کی رائے پروفیسر نکلسن کی

۱۔ ملاحظہ ہو حاشیہ مکتوب نمبر ۲۶ ۔

۲۔ رینالڈ اے ۔ نکلسن ۔ مترجمِ ''اسرارِ خودی'' ۔

رائے سے زیادہ قابلِ افتخار ہے ۔

سیّد نجیب اشرف صاحب[1] نے اپنے مضمون میں محمد دارال[2] کے ''لطیفۂ غیبیہ'' کا ذکر کیا ہے ۔ یہ چھوٹی سی کتاب ہے اور میں نے ایران سے منگوائی ہے ۔ اگر وہ یا آپ اُسے دیکھنا چاہیں تو بھیج دوں ۔ ندوے والے اُسے دیکھیں گے تو کوئی نہ کوئی بات پیدا کریں گے ۔

اب کے انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے پر آپ سے ملنے کی توقع تھی ۔ میں اسی خیال سے جلسے میں گیا تھا کہ آپ کو اپنے یہاں مہمان کرنے کے لیے لیتا آؤں گا ۔ مگر جلسے میں جا کر مایوسی ہوئی ۔ انشاء اللہ پھر کوئی موقع پیدا ہوگا ۔ کیا ''تفہیماتِ الٰہیہ''[3] چھپ گئی ہے ؟ اُمید کہ مزاج بخیر ہوگا ۔ والسلام

مخلص ، محمد اقبال

۳۳

لاہور

۱۸ ۔ اگست ۱۹۲۳ء

مخدومی ، السلام علیکم

حال میں امریکہ کی ایک مشہور یونیورسٹی (کولمبیا) نے ایک

۱۔ (م ۴ ستمبر ۱۹۵۶ء) اُن دنوں ''معارف'' کے نائب مدیر تھے ۔ مکتوب الیہ کے ہم وطن اور قریبی عزیز تھے ۔

۲۔ حالات نہ مل سکے ۔

۳۔ تالیفِ شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) ۔

کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے "مسلمانوں کے نظریات متعلقہ مالیات[1]" - اس کتاب میں لکھا ہے کہ اجماعِ اُمّت نصِ قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے - یعنی یہ کہ مثلاً مدتِ شیرخوارگی، جو نصِ صریح کی رو سے دو سال ہے، کم یا زیادہ ہو سکتی ہے - یا حصصِ شرعی میراث میں کمی بیشی کر سکتا ہے - مصنّف نے لکھا ہے کہ بعض حنفا اور معتزلیوں کے نزدیک اجماعِ اُمت یہ اختیار رکھتا ہے مگر اُس نے کوئی حوالہ نہیں دیا - آپ سے یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود[2] ہے؟

امرِ دیگر یہ ہے کہ آپ کی ذاتی رائے اس بارے میں کیا ہے؟ میں نے مولوی ابوالکلام صاحب کی خدمت میں بھی عریضہ لکھا ہے - میں آپ کا بڑا ممنون ہوں گا اگر جواب جلد دیا جائے -

آپ کا مخلص، محمد اقبال، لاہور
۴۳ - میکلوڈ روڈ، لاہور

۱- *Mohammaden Theories of Finance*, by Nicolas P. Aghnider

۲- اجماع سے نصِ قرآنی کے منسوخ ہونے کا کوئی قائل نہیں - امریکی مصنّف نے غلط لکھا ہے - آمدی "الاحکام" میں لکھتے ہیں: "مذھب الجمھور ان الاجماع لاینسخ بہ خلاف بعض المعتزلۃ" (ج ۳، ص ۲۲۹) - بعض معتزلہ ایسا کہتے تھے مگر اُن کی رائے مقبول نہیں ہو سکتی - آمدی نے حصۂ شرعی کے ایک خاص مسئلے کے باب میں ایک حوالہ نقل کیا ہے - پھر اس کا جواب دے دیا ہے - اس لیے امریکی مصنف کا استدلال غلط محض ہے (سید سلیمان ندوی) -

۳۴

لاہور

۲۷ - اگست ۱۹۳۸ء

مخدوم محترم ، السلام علیکم

نوازش نامہ ابھی ملا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔

۱- آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ فقہاء نے اجماع سے نص کی تخصیص جائز سمجھی ہے - ایسی تخصیص یا تعمیم کی مثال اگر کوئی ہو تو اس سے آگاہ فرمائیے ۔

اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ ایسی تخصیص یا تعمیم صرف اجماعِ صحابہؓ ہی کر سکتا ہے یا علما و مجتہدینِ اُمت بھی کر سکتے ہیں ؟ اگر مسلمانوں کی تاریخ میں صحابہ کے بعد کوئی ایسی مثال ہو تو اس سے بھی آگاہ فرمائیے ؛ یعنی یہ کہ کس مسئلے میں صحابہؓ نے یا علمائے اُمّت نے نص کے حکم کی تخصیص و تعمیم کر دی - میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ تخصیص یا تعمیمِ حکم سے آپ کی کیا مراد ہے ؟

۲- دیگر آپ کا ارشاد ہے کہ اگر صحابہ کا کوئی حکم نص کے خلاف ہے تو اس کو اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ کوئی ناسخ حکم اُن کے علم میں ہوگا جو ہم تک روایۃً نہیں پہنچا ۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کوئی حکم ایسا بھی ہے جو صحابہ

نے نصِ قرآن کے خلاف نافذ کیا ہو اور وہ کون سا حکم ہے؟[۱]
یہ بات کہ کوئی ناسخ حکم اُن کے علم میں ہوگا ، محض حسنِ ظن پر مبنی ہے ، یا آج کل کی قانونی اصطلاح میں "لیگل فکشن[۲]" ہے - علامہ آمدی[۳] کے قول سے تو بظاہر امریکن مصنف کی تائید ہوتی ہے ، گو صرف اسی حد تک کہ اجماعِ صحابہؓ نصِ قرآنی کے خلاف (حکم) کر سکتا تھا - بعد کے علماء ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ اُن کے علم میں کوئی ناسخ حکم نہیں ہو سکتا -

۳- اگر صحابہؓ کے اجماع نے کوئی حکم نصِ قرآنی کے خلاف نافذ کیا تو علامہ آمدی کے خیال کے مطابق ایسا کسی ناسخ حکم کی بنا پر ہوا ہے - وہ ناسخ حکم سوائے حدیثِ نبوی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا - اس سے معلوم ہوا کہ حدیث ناسخِ قرآن ہو سکتی ہے جس سے کم از کم مجھے تو انکار ہے اور غالباً آپ کو بھی ہوگا - مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو دوبارہ زحمت دینے پر مجبور ہوا لیکن آپ کے وسیع اخلاق پر بھروسہ کر کے یہ جرأت کی ہے -

جو کتاب امریکہ میں چھپی ہے اُس کا نشان مندرجہ ذیل ہے:

Mohammadan Theories of Finance, by Nicolas P. Aghnider.

۱- ایسا کوئی حکم نہیں اور نہ نصِ قرآن کے خلاف کوئی حکم صحابہ نے دیا ہے - (س)

۲- Legal Fiction -

۳- علامہ علی بن محمد آمدی (م ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ع) صاحبِ "الاحکام فی اصول الاحکام -"

یہ کتاب کولمبیا یونیورسٹی نے شائع کی ہے ۔ قیمت غالباً دس بارہ روپے سے زیادہ نہ ہوگی ۔ اگر آپ اسے منگوانا چاہیں تو کسی تاجرِ کتبِ امریکائی کے ذریعے سے منگوا سکتے ہیں ۔ تھیکر اسپنک یا میکمیلن کلکتہ بھی منگوا کر دے سکتا ہے ۔ ان کو مفصّل پتا لکھ بھیجیے یا براہِ راست سیکرٹری کولمبیا یونیورسٹی شہر نیویارک (امریکہ) سے خط و کتابت کیجیے ۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ، اور خط کا جواب جلد ملے گا ۔

مخلص ، محمد اقبال بیرسٹر ، میکلوڈ روڈ لاہور

۳۵

مخدومی ، السلام علیکم

میں نے کل ایک عریضہ ارسالِ خدمت کیا تھا ۔

تخصیص و تعمیمِ احکام کا جہاں تک تعلق ہے ، اس خط کے جواب کی زحمت گوارا نہ فرمائیے کیونکہ قاضی شوکانی[۱] کی (کتاب) "ارشاد الفحول[۲]" سے اس کا حال مجھے معلوم ہو گیا ہے ۔ البتہ باقی خط کا جواب ضرور عنایت فرمائیے ۔ علامہ آمدی کی کتاب ، جہاں تک مجھے معلوم ہے ، یہاں نہیں ہے ۔ انشاء اللہ سرما میں یونیورسٹی کے لیے ایک کاپی منگوانے کی کوشش کروں گا ۔ پنجاب میں ایک

۱۔ محمد بن علی شوکانی (م جمادی الاخریٰ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) ۔

۲۔ "ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الاصول" مصر میں متعدد مرتبہ شائع ہو چکی ہے ۔

صاحب نے حال میں قرآن کی تفسیر شائع کی ہے جس کا نام 'تذکرہ'[۱] ہے ۔ کتاب آپ کی نظر سے گزری ہے ؟ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا ریویو مفصّل آپ کے قلم سے نکلے ۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا ۔

والسلام مخلص ، محمد اقبال ، لاہور

۱۹ - اگست ۱۹۲۴ء

۳۶

لاہور

۵ ستمبر ۱۹۲۴ء

والا نامہ ابھی ملا ہے جس کے مضمون سے بہت تسکین ہوئی ۔ انجمنِ حمایتِ اسلام کا صدر مجھے منتخب کیا گیا تھا مگر میں نے بعض وجوہ سے استعفا دے دیا ہے ۔ کونسل میں اختلاف ہے اور عام حالت اس انجمن کی اچھی نہیں ہے ۔ بعض ارکان ذاتی اغراض سے اس میں داخل ہیں اور اُن کے نزدیک انجمن ان اغراض کے حصول کا ذریعہ ہے اور بس ۔ اس وقت وہی جماعت جلسے کی تیاریاں کر رہی ہے ۔ مگر آپ ضرور تشریف لائیے ۔ یہاں کے لوگوں کو ختمِ نبوت کے مسئلے میں بڑی دلچسپی ہے اور آپ کی تقریر انشاء اللہ بے حد توجہ سے سنی جائے گی ۔ اس کے علاوہ میں ایک مدت سے آپ کی ملاقات کا اشتیاق رکھتا ہوں ۔ میرے ہی غریب خانے پر ٹھہریے ۔ یہاں سے انجمن کا جلسہ گاہ کچھ دور نہیں ۔ موٹر پر چھ منٹوں کی راہ ہے ۔

۱۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ : فکری تحریکوں میں اقبال کا مقام ۔

جنابِ مشرقی[1] امرتسر کے رہنے والے ہیں ۔ نوجوان آدمی ہیں ۔ کیمبرج میں ریاضی کا اعلیٰ امتحان پاس کیا ۔ ہندوستان واپس آئے تو کچھ مدت کے لیے پشاور کالج کے پرنسپل رہے ۔ اس کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمۂ تعلیم میں رہے ۔ آج کل غالباً کسی سرکاری سکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں ۔ مجھے ان کی قابلیت کا حال زیادہ معلوم نہیں ، مگر اس کتاب کے ریویو سے جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ مغربی افکار پر بھی اُن کی نظر نہایت سطحی ہے ۔ باقی تفسیرِ قرآن اور تاریخِ اسلام کے متعلق آپ مجھ سے بہتر اندازہ کر سکتے ہیں ۔ آن کی کتاب کے متعلق یہاں عجیب و غریب افواہیں ہیں ، زبانی عرض کروں گا ۔ 'زمیندار' میں 'تذکرہ' پر ایک ریویو مفصّل شائع ہوا ہے جو مصنف نے محنت و کاوش سے لکھا ہے ، مگر سید سلیمان ندوی کی اسٹائل اور وسعتِ نظر آس کو حاصل نہیں ۔ مجھے 'تذکرہ' کا علم اسی ریویو سے ہوا ۔

جنابِ مشرقی ، جہاں تک مجھے معلوم ہے ، خود مدعی نہیں ہیں ۔ اُمّتِ مسلمہ[2] سے ممکن ہے آن کا تعلق ہو کیونکہ آج کل اُمّتِ مسلمہ کا سنٹر امرتسر ہے ۔ بہائی فرقے[3] سے بھی جہاں تک مجھے معلوم ہے

۱۔ علامہ عنایت اللہ مشرقی ۔ بانیِ "خاکسار تحریک" (م ۲۷ اگست ۱۹۶۳ع) ۔

۲۔ خواجہ احمد دین امرتسری (م ۱۹۳۶ع) کی قائم کردہ جماعت جو احادیثِ رسول کو حجت تسلیم نہ کرتی تھی ۔ یہ جماعت کچھ عرصہ قائم رہنے کے بعد منتشر ہو گئی ۔

۳۔ بہاء اللہ ایرانی کی جماعت جس کے مبلّغین نے برصغیر میں دعوت و تبلیغ کا کام شروع کر دیا تھا ۔

اُن کا تعلق نہیں ہے - مختصر یہ ہے کہ یورپین افکار کی تاریخ کا اعادہ آج کل دنیائے اسلام میں ہو رہا ہے - ان حالات میں جو اس وقت کیفیت آپ کے قلب کی ہے ، وہ ایک حد تک نیچرل امر ہے - مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ جو کام کر رہے ہیں وہ اُمّتِ مسلمہ کے لیے از بس مفید ہے - دنیائے اسلام اس وقت ایک روحانی پیکار میں مصروف ہے - اس پیکار و انقلاب کا رخ متعین کرنے والے قلوب و اذہان پر شک و ناامیدی کی حالت کبھی کبھی پیدا ہو جاتی ہے - مجھے یقین ہے کہ آپ کا قلب قوی ہے اور ذہن ہمہ گیر - آپ اس حالت سے جلد نکل جائیں گے - یا صوفیہ کی اصطلاح میں یوں کہیے کہ اس مقام کو جلد طے کر لیں گے - آپ قلندر ہیں مگر وہ قلندر جس کی نسبت اقبال نے یہ کہا ہے :

قلندراں کہ براہِ تو سخت می کوشند
ز شاہ باج ستانند و خرقہ می‌پوشند

بجلوت اند و کمندے بہ مہر و مہ پیچند
بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند

درین جہاں کہ جمالِ تو جلوہ ھا دارد
ز فرق تا بہ قدم دیدہ و دل و گوشند

بروزِ بزم سراپا چو پرنیان و حریر
بروزِ رزم خود آگاہ و تن فراموشند

آپ اس جماعت کے پیش خیمہ ہیں - اس جماعت کا دنیا میں عنقریب پیدا ہونا قطعی اور یقینی ہے - باقی جس راہ پر آپ اس سے

پہلے قدم زن[1] تھے اس کے متعلق انشاء اللہ بوقت ملاقات گفتگو ہوگی۔ ہندوستانی نیشنلزم کی انتہا یہی تھی جو آپ کے مشاہدے میں آ گئی۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ یہ خط بستر پر لیٹے لیٹے لکھا ہے۔ آج طبیعت بہت مضمحل ہے۔ بدخطی معاف فرمائیے گا۔

مخلص، محمد اقبال

۳۷

مخدومی، السلام علیکم

آپ نے کسی گذشتہ خط میں مجھے لکھا تھا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو آپ بعض دفعہ وحی کا انتظار فرماتے۔ اگر وحی نازل ہوتی تو اس کے مطابق مسائل کا جواب دیتے اور اگر وحی کا نزول نہ ہوتا تو قرآن شریف کی کسی آیت سے استدلال فرماتے اور جواب کے ساتھ وہ آیت بھی پڑھ دیتے۔ اس کا حوالہ کون سی کتاب میں ملے گا؟ کیا یہ قاضی شوکانی کی کتاب ''ارشاد الفحول'' سے آپ نے لیا ہے[2]؟

دوسرا امر جو اس کے متعلق دریافت طلب ہے، یہ ہے کہ جو جواب وحی کی بنا پر دیا گیا وہ تمام اُمّت پر حجّت ہے۔ (اور وہ وحی بھی قرآن شریف میں داخل ہوگئی) لیکن جو جواب محض استدلال کی بنا پر دیا گیا، جس میں وحی کو دخل نہیں، کیا وہ بھی تمام اُمّت

۱۔ اشارہ کانگرس کی طرف ہے۔ (س)

۲۔ اس کا ذکر کتبِ احادیث میں ہے۔ (س)

پر حجت ہے[1] ؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ حضورؐ کے تمام استدلالات بھی وحی میں داخل ہیں[2] - یا بالفاظ دیگر یہ کہ قرآن و حدیث میں کوئی فرق نہیں[3] - جواب سے مطلع فرما کر ممنون فرمائیے -

مخلص ، محمد اقبال ، لاہور

۱۶ - اکتوبر ۱۹۲۴ع

۳۸

لاہور

۱۸ مارچ ۱۹۲۶ع

مخدومی ، السلام علیکم

اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہِ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے - اس مبحث پر مصر میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی تھی جو میری نظر سے گزری ہے ، مگر افسوس ہے کہ بہت مختصر ہے اور جن مسائل پر بحث کی ضرورت ہے ، مصنف نے اُن کو نظر انداز کر دیا ہے - اگر مولانا شبلی[4] زندہ ہوتے تو میں اُن سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا - موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا - میں نے ایک رسالہ اجتہاد

۱- بلاشبہ - (س)

۲- وحی خفی میں داخل ہیں - (س)

۳- جی نہیں ، دونوں میں بہت فرق ہے - قرآنِ پاک بالفاظِ وحی ہے اور بہ تواتر منقول ہے اور یہ حدیثیں وحی سے معناً ماخوذ ہیں اور بہ تواتر منقول نہیں - (س)

۴- استادِ مکتوب الیہ (م ۱۹۱۴ع) -

پر لکھا تھا[1] مگر چونکہ میرا دل بعض امور کے متعلق خود مطمئن نہیں ، اس واسطے اس کو اب تک شائع نہیں کیا ۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ سے بھی کئی آمور کے متعلق استفسار کیا تھا ۔ مسلمانوں پر اس وقت (دماغی اعتبار سے) وہی زمانہ آ رہا ہے جس کی ابتدا یورپ کی تاریخ میں لوتھر[2] کے عہد سے ہوئی ۔ مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت راہنما نہیں ہے ، اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں ۔ نہ عامۃ المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاحِ لوتھر نے مسیحیت کے لیے کیا کیا نتائج پیدا کیے ۔

ہندوستان کی جمعیۃ العلماء کی توجہ اس طرف ضروری ہے ۔ آپ چونکہ اس جمعیت کے صدر ہیں اس واسطے آپ سے درخواست ہے کہ اس کام کو مستقل طور پر اپنے ہاتھ میں لے لیجیے ۔ ندوہ کے دیگر ارکان یا فارغ التحصیل طلبہ کو بھی اپنے ساتھ ملائیے تاکہ اقوامِ اسلامیہ کو فقہِ اسلامی کی اصل حقیقت معلوم ہو ۔ میں نے سنا ہے کہ البانیا کے مسلمانوں نے وضو اڑا دیا[3] اور ممکن ہے نماز میں بھی کوئی ترمیم کی ہو ۔ ٹرکی کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہے[4] ۔ مصر میں یہ تحریک جاری ہے[5] اور عنقریب ایران اور افغانستان

۱۔ مولانا عبدالماجد کے نام خطوط میں ''رسالۂ اجتہاد'' کا ذکر ملتا ہے اور مولانا عبدالماجد نے اسے پسند نہ کیا تھا ۔

۲۔ مارٹن لوتھر (م ۱۵۴۶ء) : جرمن مذہبی مصلح ، عیسائیت کی تحریکِ اصلاح کا بانی ۔

۳۔ یہ خبر غلط تھی (س) ۔

۴۔ ترکی میں نماز میں کوئی تغیّر نہیں ہوا (س) ۔

۵۔ یہ خبر بھی بے اصل ہے (س) ۔

میں بھی اس کا ظہور ہوگا۔ ایران کو بابیت[1] سے اندیشہ ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اسماعیلی تحریک[2] کہیں پھر زندہ نہ ہو جائے۔ ایک قدیم اسلامی اصطلاح ہے ''صوت الحیٰ''۔ شاید اس کا مفہوم قبیلے کی آواز ہے کیونکہ اس وقت دنیائے اسلام میں کوئی خاص مذہبی شخصیت نہیں جو طبائع کے اس انقلاب کو ٹھیک رستے پر لگائے۔ غرضکہ اس وقت مذہبی اعتبار سے دنیائے اسلام کو راہنمائی کی سخت ضرورت ہے۔ اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے بعض علماء اس کام کو باحسن وجوہ انجام دے سکتے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے تو ہم باقی اقوامِ اسلامیہ کو کوئی ایسی مدد نہیں دے سکتے، ہاں دماغی اعتبار سے ان کے لیے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔

دیگر امر دریافت طلب یہ ہے کہ آیۂ توریث[3] میں حصص

۱۔ مرزا علی محمد باب کی برپا کردہ تحریک (۱۸۱۹-۱۸۴۴ء) جو بعد میں بہائیت کی صورت میں رونما ہوئی۔

۲۔ اسماعیلی تحریک کا بنیادی تصور یہ ہے کہ دین کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ دین کے ظاہر و باطن دونوں پر یقین رکھنا ضروری ہے۔ دین کی باطنی تفسیر کا اختیار امام کو حاصل ہے۔

۳۔ نساء: ۱۱-۱۲ ''ترجمہ: تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اگر (میت کی وارث) دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔ اگر میت صاحبِ اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہیے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

بھی ازلی ابدی[1] ہیں یا قاعدۂ توریث میں جو اصول مضمر ہے، صرف وہی ناقابلِ تبدیل ہے اور حصص میں حالات کے مطابق تبدیلی ہو

۱- بے شک (س) -

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اور اگر وہ صاحبِ اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے -

اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصے کی حق دار ہوگی -

یہ سب حصے اُس وقت نکالے جائیں گے جب کہ وصیت، جو میت نے کی ہو، پوری کر دی جائے اور قرض جو اس پر ہو ادا کر دیا جائے -

تم نہیں جانتے کہ تمھارے ماں باپ اور تمھاری اولاد میں سے کون بلحاظِ نفع تم سے قریب تر ہے اور یہ حصے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے -

اور تمھاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصہ تمھیں ملے گا، اگر وہ بے اولاد ہوں، ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکہ کا ایک چوتھائی حصہ تمھارا ہے، جبکہ وصیت جو انھوں نے کی ہو پوری کر دی جائے، اور قرض جو انھوں نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے - اور وہ تمھارے ترکہ میں سے چوتھائی کی حقدار ہوں گی اگر تم بے اولاد ہو ورنہ صاحبِ اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہوگا، بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کر دیا جائے - اور اگر وہ مرد یا عورت (جس کی میراث تقسیم طلب ہے) بے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا - اور اگر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

سکتی ہے[1] -

آیۂ وصیّت[2] پر بھی جو ارشادات ہیں ، میری سمجھ میں نہیں آئے - اس زحمت کے لیے معافی چاہتا ہوں - جب فرصت ملے ، جزئیات سے بھی آگاہ فرمائیے - اس احسان کے لیے ہمیشہ شکر گزار رہوں گا - بعض خیالات زمانۂ حال کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کا نتیجہ ہیں - ان کے ادا کرنے کے لیے قدیم فارسی اسلوبِ بیان سے مدد نہیں ملتی - بعض تاثرات کے اظہار کے لیے الفاظ ہاتھ نہیں آتے - اس واسطے مجبوراً ترکیب اختراع کرنی پڑتی ہے جو ضرور ہے کہ اہلِ زبان کو ناگوار ہو کہ دل و دماغ اس سے مانوس نہیں ہیں - بعض اشعار کے لکھنے میں تو مجھے اس قدر روحانی تکلیف ہوئی کہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی - تاہم اللہ تعالیٰ کا شکر ہے - کاش چند روز کے لیے آپ سے ملاقات ہوتی اور آپ کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملتا -

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا -

آپ کا مخلص محمد اقبال

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکے کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے ، جبکہ وصیّت جو کی گئی ہو ، پوری کر دی جائے اور قرض ، جو میت نے چھوڑا ہو ، ادا کر دیا جائے ، بشرطیکہ کہ وہ ضرر رساں نہ ہو - یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا و بینا اور نرم خو ہے“ -

۱- کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی (س) -

۲- نساء : ۱۲ (ترجمے کے لیے سابقہ حاشیہ ملاحظہ ہو) -

۳۹

لاہور

۷ اپریل ۱۹۲۶ء

مخدومی ، السلام علیکم

آپ کے بعض خطوط میرے پاس محفوظ ہیں اور یہ آخری خط بھی ، جو نہایت معنی خیز ہے اور جس کے مضمون سے مجھے بحیثیتِ مجموعی پورا اتفاق ہے ، محفوظ رہے گا ۔ عبادات کے متعلق کوئی ترمیم و تنسیخ میرے پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ میں نے اپنے مضمون 'اجتہاد' میں ان کی ازلیت و ابدیت پر دلائل قائم کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ہاں معاملات کے متعلق بعض سوالات دل میں پیدا ہوتے ہیں ۔ اس ضمن میں چونکہ شرعیتِ احادیث (یعنی وہ احادیث جن کا تعلق معاملات سے ہے) کا مشکل سوال پیدا ہو جاتا ہے ، اور ابھی تک میرا دل اپنی تحقیقات سے مطمئن نہیں ہوا ، اس واسطے وہ مضمون شائع نہیں کیا گیا ۔ میرا مقصود یہ ہے کہ زمانۂ حال کے جورس پروڈنس کی روشنی میں اسلامی معاملات کا مطالعہ کیا جائے ، مگر غلامانہ انداز میں نہیں بلکہ ناقدانہ انداز میں ۔ اس سے پہلے مسلمانوں نے عقائد کے متعلق ایسا ہی کیا ہے ۔ یونان کا فلسفہ ایک زمانے میں انسانی علوم کی انتہا تصور کیا گیا مگر جب مسلمانوں میں تنقید کا مادہ پیدا ہوا تو انھوں نے اسی فلسفے کے ہتھیاروں سے اس کا مقابلہ کیا ۔ اس عصر میں معاملات کے متعلق بھی ایسا ہی کرنا ضروری ہے ۔ قاعدۂ میراث کے حصص کے متعلق میں نے مضمون 'اجتہاد' میں یہی طریق اختیار کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ لڑکی کو لڑکے سے آدھا حصہ

ملنا عین انصاف ہے ۔ مساوی حصہ ملنے سے انصاف قائم نہیں رہتا ہے ۔ بحث کا محرک ترکی شاعر ضیابک[1] کی بعض تحریریں تھیں جن میں وہ اسلامی طلاق اور میراث کا ذکر کرتا ہے ۔ میں نے جو حصص کے متعلق آپ سے دریافت کیا تھا اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ میں ان حصص میں ترمیم چاہتا ہوں ، بلکہ خیال یہ تھا کہ شاید ان حصص کی ازلیت و ابدیت پر آپ کوئی روشنی ڈالیں گے ۔ میرے نزدیک اقوام کی زندگی میں 'قدیم' ایک ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا کہ 'جدید' بلکہ میرا ذاتی میلان قدیم کی طرف ہے ۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ اسلامی ممالک میں عوام اور تعلیم یافتہ لوگ دونوں طبقے علوم اسلامیہ سے بے خبر ہیں ۔ اس بے خبری سے آپ کی اصطلاح میں یورپ کے ''معنوی استیلاء'' کا اندیشہ ہے جس کا سدِ باب ضروری ہے ۔ میرا ایک مدت سے یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ، جو سیاسی اعتبار سے دیگر ممالکِ اسلامیہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے ، دماغی اعتبار سے اُن کی بہت کچھ مدد کر سکتے ہیں ۔ کیا عجب ہے کہ اسلامی ہند کی آیندہ نسلوں کی نگاہوں میں ''ندوہ'' علی گڑھ سے زیادہ کارآمد ثابت ہو ۔ آپ کے خط کے آخری حصے سے ایک اور سوال میرے دل میں پیدا ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ امام کو اختیار ہے کہ قرآن کی کسی مقرر کردہ حد (مثلاً سرقہ کی حد) کو ترک کر دے[2] اور اس

۱۔ 'ترکی کا معروف قوم پرست راہنما اور شاعر ۔

۲۔ ''ترک کر دے'' کا لفظ صحیح نہیں ۔ ملتوی کر دے صحیح ہے ۔ جیسے میدانِ جنگ میں جب اسلامی فوج دارالحرب میں یا دارالحرب سے قریب ہو ، حدود بمصالح ملتوی کر دیے جاتے ہیں ۔ (س)

کی جگہ کوئی اور حد مقرر کر دے۔ اور اس اختیار کی بنا کون سی آیتِ قرآنی ہے؟ حضرت عمرؓ نے طلاق کے متعلق جو مجلس[۱] قائم کی ہے، اس کا اختیار اُن کو شرعاً حاصل تھا۔[۲] میں اس اختیار کی اساس معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ زمانۂ حال کی زبان سے یوں کہیے کہ آیا اسلامی کانسٹی ٹیوشن اُن کو ایسا اختیار دیتی تھی؟ 'امام' ایک شخصِ واحد ہے یا جماعت بھی 'امام' کے قائم مقام ہو سکتی ہے؟ ہر اسلامی ملک کے لیے اپنا امام ہو یا تمام اسلامی دنیا کے لیے ایک واحد امام ہو؟ مؤخر الذکر صورت موجودہ فرقِ اسلامیہ کی موجودگی میں کیونکر بروئے کار آ سکتی ہے؟ مہربانی کر کے ان سوالات پر روشنی ڈالیے۔ لقب 'امام' سے بہت سی مشکلات کا خاتمہ ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس کو وہ اختیارات شرعاً حاصل ہوں جن کا اشارہ آپ نے کیا ہے۔[۳]

۱- میری عبارت کے سمجھنے میں یا اقبال نے خود اپنے مطلب کی تعبیر میں غلطی کی ہے۔ حضرت عمرؓ سے پہلے ایک مجلس یعنی ایک ہی نشست میں تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو تین قرار دیا۔ بات یہ تھی۔ (س)

۲- حنفیہ کا قول ہے کہ حضرت عمرؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم معلوم ہوا جس کی اشاعت عہدِ اول میں نہیں ہو سکی تھی اور حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں کی۔ حافظ ابنِ قیّم (م ۱۳۵۰ع/ ۷۵۱ھ) کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے تعزیراً ایسا کیا تھا اور امام کو تعزیراً ایسا کرنے کا اختیار ہے۔ (س)

۳- میں نے اُن کو لکھا تھا کہ مسائلِ فقہیہ میں ترجیح اور بعض میں التوا یا اجرائے تعزیر مفتیوں کا نہیں بلکہ امام کا حق ہے۔ (س)

ترجمہ جو آپ نے ارسال کیا ہے، افسوس ہے کہ وہ 'معارف' کے قابل نہیں ہے۔ میں نے یہ مضمون اُن طلباء کے لیے لکھا تھا جو اضافیت سے کسی قدر آشنا تھے۔ اس واسطے مختصر لکھا۔ مفصل لکھنے کے لیے نہ وقت تھا نہ ضرورت۔ غالباً ایسے ریڈر کو اس سے کچھ فائدہ نہ پہنچے گا جو فلسفے کے بعض مسائل اور نظریہ' اضافیت سے آشنا نہیں ہے۔ بہرحال میں نے ایک صاحب سے کہا ہے کہ وہ اس کا اردو ترجمہ 'معارف' کے لیے کریں۔ وہ ترجمہ کریں گے، پھر میں اُسے دیکھ کر آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا۔ جامعہ کا ترجمہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ قادیانیوں نے بھی ایک ترجمہ اس مضمون کا کیا تھا مگر وہ بھی غلط تھا۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ خدا تعالیٰ آپ کو اطمینان عطا فرمائے کہ آپ کا اطمینان اور خانگی پریشانیوں سے آزادی ہم سب کے لیے از بس ضروری ہے۔

مخلص، محمد اقبال

۴۰

لاہور

۲۳ اپریل ۱۹۲۶ء

مخدومی، السلام علیکم

آپ اپنے نوازش نامے کی طوالت کے لیے عذرخواہی کرتے ہیں مگر میرے لیے یہ طویل خط باعثِ خیر و برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ میں نے اسے کئی دفعہ پڑھا اور گزشتہ

رات چودھری غلام رسول مہر[1] سے بھی پڑھوا کر سنا ۔ اور احباب بھی اس مجلس میں شریک تھے ۔ اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کر سکتا ۔ فی الحال انشاء اللہ آپ کی مدد سے کچھ نہ کچھ لکھوں گا ۔

مضمون 'اجتہاد' کی تکمیل کے بعد حافظ ابن قیمؒ کی کتاب ''طرق الحکمیہ'' پر اور اس کے بعد ''المقابلات'' پر، جس کا ذکر آپ نے اپنے خط میں کیا ہے، لکھنے کا ارادہ ہے ۔ شریعتِ احادیث کے متعلق جو کھٹک میرے دل میں ہے[2]، اس کا مطلب یہ نہیں کہ احادیث سرے سے بیکار ہیں ۔ ان میں ایسے بیش بہا اصول ہیں کہ سوسائٹی باوجود اپنی ترقی و تعالی کے اب تک اُن کی بلندیوں تک نہیں پہنچی ۔ مثلاً ملکیتِ شاملاتِ دہ کے متعلق ''المرعی للہ و رسولہ[3]'' (بخاری)، اس حدیث کا ذکر میں نے مضمون 'اجتہاد' میں بھی کیا ہے ۔ بہرحال چند امور اور دریافت طلب ہیں ۔ اگرچہ آپ اس وقت سفرِ حجاز کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے، تاہم مجھے یقین ہے کہ آپ از راہِ عنایت میرے سوالات پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالیں گے ۔[4]

۱- آپ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی دو حیثیتیں ہیں :

۱- ایڈیٹر روزنامہ ''انقلاب'' اور علامہ کے نیازمند (م ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء) ۔

۲- میں نے اُن کو اس کا تسلی بخش جواب لکھ دیا تھا ۔ (س)

۳- ترجمہ : چراگاہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے ہیں ۔

۴- اُن تمام امور کے جواب ''سیرۃ النبی'' جلد چہارم کے مقدمے میں مذکور ہیں ۔ مختصراً جواب یہاں بھی حوالۂ قلم ہیں (س) ۔

نبوت اور امامت - نبوت میں احکامِ قرآنی اور آیاتِ قرآنی سے حضور ﷺ کے استنباط داخل ہیں - اجتہاد کی بنا محض عقلِ بشری اور تجربہ و مشاہدہ ہے یا یہ بھی وحی میں داخل ہے - اگر وحی میں داخل ہے تو اس پر آپ کیا دلیل قائم کرتے ہیں[۱] ؟ میں خود اس کے لیے دلیل رکھتا ہوں مگر میں اس پر اعتماد نہیں کرتا اور آپ کا خیال معلوم کرنا چاہتا ہوں - وحیِ غیر متلو کی تعریف نفسیاتی اعتبار سے کیا ہے ؟ کیا وحی متلو اور غیر متلو کے امتیاز کا پتا رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں چلتا ہے یا یہ اصطلاحات بعد میں وضع کی گئیں[۲] ؟

۲- حضور ﷺ نے اذان کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ کیا - کیا یہ مشورہ نبوت کے تحت میں آئے گا یا امامت کے تحت میں[۳] ؟

۱- اجتہادِ نبوی کی بنیاد عقلِ بشری اور تجربہ و مشاہدہ پر نہیں بلکہ عقلِ نبوی کا نتیجہ ہے جو عقلِ بشری سے مافوق ہے اور جس میں عقلِ بشری و تجربہ و مشاہدہ کو دخل نہیں اور نبی کی ہر غلطی کی اصلاح کا اللہ تعالیٰ ذمہ دار ہے - پس اجتہادِ نبوی کے نتائج بھی اگر غلط ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کی اصلاح فرماتا جیسا کہ چار پانچ مقام پر اصلاح فرما دیا ہے - پس جب بقیہ اجتہاداتِ نبوی کی اصلاح نہیں فرمائی تو تقریراً وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صحیح قرار دیے گئے اور اس لیے وہ واجب القبول ہیں - (س)

۲- اصطلاح بعد میں پیدا ہوتی ہے (س) -

۳- آنحضرتؐ کو بعض روایات کے رو سے خود بھی اللہ تعالیٰ نے اس طریقے کی تعلیم دی تھی اور دوسرے صحابہ نے بھی خواب میں دیکھا تھا - البتہ اس باب میں صحابہ سے مشورہ کرنا بابِ امامت سے تھا ، نہ کہ نبوت سے کہ احکامِ نبوت میں مشورہ نہیں - (س)

۳- فقہا کے نزدیک خاوند کو جو حق اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ہے، وہ بیوی کو یا اُس کے کسی خویش یا کسی اَور آدمی کے حوالے کیا جا سکتا ہے؟ اس مسئلے کی بنا کوئی آیتِ قرآنی ہے یا حدیث؟[1]

۴- امام ابو حنیفہ[2] کے نزدیک طلاق یا خاوند کی موت کے دو سال بعد بھی اگر بچہ پیدا ہو تو قیاس اُس بچے کے ولد الحرام ہونے پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس مسئلے کی اساس[3] کیا ہے؟ کیا یہ اصول محض ایک قاعدۂ شہادت ہے یا جزوِ قانون ہے؟ اس سوال کے پوچھنے کی وجہ یہ ہے کہ مروجہ ایکٹ شہادت کی رُو سے تمام وہ قواعدِ شہادت، جو اس ایکٹ کے نفاذ سے پہلے ملک میں مروج تھے، منسوخ کیے گئے۔ ہندوستان کی عدالتوں نے مذکورہ بالا اصول کو قاعدۂ شہادت قرار دے کر منسوخ کر دیا۔ نتیجہ اس کا بعض مقامات میں یہ ہوتا ہے کہ ایک مسلمان بچہ، جو فقہِ اسلامی کی رُو سے ولد الحلال ہے، ایکٹ شہادت کی رُو سے ولد الحرام قرار دیا جاتا ہے۔ ایکٹ شہادت میں اَور بھی باتیں ہیں جن کا ذکر اس مضمون میں کرنے کا ارادہ ہے جو میں حافظ ابنِ قیمؒ کے فلسفۂ شہادت پر لکھوں گا۔

۱- تصریح تو احادیث میں ہے مگر قرآن پاک سے استنباط ممکن ہے (س)

۲- نعمان بن ثابت (م ۱۵۰ھ/۷۶۷ع)۔

۳- اس کی اساس ایک تو حضرت عائشہ کا قول ہے جو دار قطنی میں ہے۔ دوسرے تجربہ ہے۔ امام شافعی کے نزدیک اکثر مدتِ حمل چار برس ہے (ہدایہ)۔ (س)

امید ہے کہ آپ اس تکلیف دہی کے لیے مجھے معاف فرمائیں گے۔
میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ ذاتی لحاظ سے خدا کے فضل و کرم سے میرا دل پورا مطمئن ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے۔ حال ہی میں ایک تعلیم یافتہ عرب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ فرانسیسی خوب بولتا تھا مگر اسلام سے قطعاً بے خبر تھا۔ اس قسم کے واقعات مشاہدے میں آتے ہیں تو سخت تکلیف ہوتی ہے۔
امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص، محمد اقبال

۲۱

لاہور
۷ مارچ ۱۹۲۸ء
مخدومی، السلام علیکم

"شمسِ بازغہ"[۱] یا "صدرا"[۲] میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کیے گئے ہیں، ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے۔ "بخاری" میں ایک حدیث بھی اس مضمون کی ہے:

۱۔ تالیف محمود جونپوری (م ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ/۱۹ فروری ۱۶۵۲ء)۔
۲۔ تالیف محمد بن ابراہیم صدر الدین شیرازی (م ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء)۔

"لا تسبّو الدھر"[1] الخ - کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے - اگر ایسا ہو تو یہ بحث کہاں ملے گی؟[2]

قرونِ وسطیٰ کے ایک یہودی حکیم موسیٰ بن میمون نے لکھا ہے کہ خدا کے لیے کوئی مستقبل نہیں ہے بلکہ وہ زمان کو لحظہ بہ لحظہ پیدا کرتا ہے - میمون قرطبہ میں پیدا ہوا اور قاہرہ میں مرا ؛ غالباً بارھویں صدی کے آخر میں - اس نے مسلمانوں کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی اور تمام عمر مسلمانوں ہی کی ملازمت کرتا رہا - متکلمین کے خیالات پر اس نے جرح قدح بھی خوب کی ہے - میرا گمان ہے کہ میمون کا مذکورہ بالا مذہب بھی ضرور کسی نہ کسی مسلمان حکیم کی خوشہ چینی ہے - اگر آپ کے علم میں یہ بات ہو تو مہربانی کر کے مطلع فرمائیے - میں ایک مضمون لکھ رہا ہوں جس کا عنوان یہ ہے : "زمان کی حقیقت فلسفۂ اسلام کی تاریخ میں -"

اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا اور اس خط کا جواب جہاں تک ممکن ہو جلد دیجیے گا - والسلام

مخلص ، محمد اقبال بیرسٹر ، لاہور

۱- "لا تسبّو الدھر فان اللہ ھوالدھر" (صحیح مسلم) - ترجمہ : زمانے کو برا نہ کہو کہ زمانہ خود خدا ہے -

۲- اقبال مرحوم کو اس بحث سے بڑی دلچسپی تھی - میں نے اس پر لاہور میں ان کی ایک تقریر بھی سنی تھی - اخیر زمانے میں میرے دل میں علامہ ابن قیمؒ کی تصانیف سے ایک حقیقت فہم میں آئی جس سے بڑی خوشی ہوئی مگر افسوس کہ اس زمانے میں مرحوم بیمار تھے - انتظار تھا کہ وہ تندرست ہوں تو اُن کو سناؤں مگر افسوس : ع

جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی

مجھے یقین ہے کہ وہ اگر اس کو سنتے تو ضرور خوش ہوتے (س) -

۴۲

لاہور

۱۸ مارچ ۱۹۲۸ء

مخدومی ، السلام علیکم

نوازش نامہ مل گیا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔

ایک زحمت دیتا ہوں ، معاف فرمائیے گا : "مباحثِ مشرقیہ"[۱] لاہور میں دستیاب نہیں ہو سکتی ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ زمان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلم بند فرما کر مجھے ارسال فرما دیں ۔ میں اس کا ترجمہ نہیں چاہتا ، صرف خلاصہ چاہتا ہوں جس کے لکھنے میں غالباً آپ کا بہت سا وقت ضائع نہ ہوگا ۔

بزمِ اغیار کی رونق ضروری تھی ۔ اسلام کا ہندوؤں کے ہاتھ بِک جانا گوارا نہیں ہو سکتا ۔ افسوس اہلِ خلافت اپنی اصلی راہ سے بہت دور جا پڑے ۔ وہ ہم کو ایک ایسی قومیت کی راہ دکھا رہے ہیں جس کو کوئی مخلص مسلمان ایک منٹ کے لیے بھی قبول نہیں کر سکتا ۔

اُمید کہ مزاج بخیر ہوگا ۔ والسلام

مخلص ، محمد اقبال

۱۔ تالیف امام فخرالدین رازی (م ۶۰۶ھ/۱۲۱۰ء) ۔

۴۳

لاہور

۲۵- اپریل ۱۹۲۹ء

مخدومی ، السلام علیکم

نوازش نامہ مل گیا ہے - لکچروں کا اُردو ترجمہ انشاء اللہ کیا جائے گا -[1] اصطلاحات کے متعلق آپ سے بھی مشورہ طلب کروں گا -

سر شفیع[2] کی خدمت میں عرض کردوں گا -[3] ذوالفقار علی خاں[4] ۴ مئی کو ولایت جا رہے ہیں - اُن سے کہنا مناسب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اُن کی مالی حالت کچھ حوصلہ افزا نہیں ہے - بہتر ہو کہ آپ سر عبدالقادر سے اس کارِ خیر کے لیے چندہ طلب فرمائیے -

والسلام

مخلص ، محمد اقبال

۱- جناب سید نذیر نیازی صاحب نے یہ فریضہ انجام دیا ہے -
۲- لاہور کے مشہور مسلم لیگی رہنما -
۳- شاید ندوہ کی امداد کی درخواست ہو (س) -
۴- علامہ کے مخلص اور بے تکلف دوست (م ۲۶ مئی ۱۹۳۳ء) ، مصنف A Voice from the East. -

۴۴

لاہور

۲ ستمبر ۱۹۲۹ع

مخدومی ، السلام علیکم

ایک عریضہ ارسالِ خدمت کر چکا ہوں - امید کہ پہنچ کر ملاحظۂ عالی سے گزرا ہوگا - جس باب میں مولانا شبلیؒ نے ایک فقرہ شعائر و ارتفاقات کے متعلق نقل کیا ہے ، اُسی باب میں ایک اور فقرہ نظر سے گزرا جو پہلے نظر سے نہ گزرا تھا :

"و شعائر الدین امر ظاہر یختص بہ و یمتاز صاحبہ بہ فی سائر الادیان کالختان و تعظیم المساجد والاذان والجمعة والجماعات ۔"[1]

یہ شاہ صاحب[2] کی اپنی تشریح ہے - جناب کا ارشاد اس بارے میں کیا ہے ؟ علی ھذا القیاس ارتفاقات میں شاہ صاحب کی تشریح کے مطابق تمام تدابیر ، جو سوشل اعتبار سے نافع ہوں ، داخل ہیں : مثلاً نکاح و طلاق کے احکام وغیرہ - اگر شاہ صاحب کی عبارت کی یہ تشریح صحیح ہے تو حیرت انگیز ہے - اگر ان معاملات میں تھوڑی

۱- ترجمہ : شعائر دین ایسی ظاہر خصوصیت ہے جس کے سبب وہ (شعائر کا اختیار کرنے والا) دوسرے جملہ ادیان سے ممتاز ہو جاتا ہے - جیسے ختنہ ، مساجد کی تعظیم ، اذان ، نماز جمعہ اور دوسری جماعتیں -

۲- شاہ ولی اللہ مؤلفِ "حجۃ اللہ البالغہ" (م ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ع) -

سی ڈھیل بھی دی جائے تو سوسائٹی کا کوئی نظام نہ رہے گا۔[1] ہر ایک ملک کے مسلمان اپنے اپنے دستور و مراسم کی پابندی کریں گے۔ ستمبر کے 'معارف' کا شدت کے ساتھ منتظر ہوں۔ جلد بھجوائیے۔

والسلام

مخلص، محمد اقبال

۴۵

لاہور

۲۳ ستمبر ۱۹۲۹ء

مخدومی، السلام علیکم

''الکلام'' (یعنی علمِ کلامِ جدید) کے صفحات ۱۱۳-۱۱۴ پر مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ[2] (صفحہ ۱۲۳) کا ایک فقرہ عربی میں نقل کیا ہے جس کے مفہوم کا خلاصہ انھوں نے اپنے الفاظ میں بھی دیا ہے۔ اس عربی فقرہ کے آخری حصے کا ترجمہ ہے:

''اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان طریقہ کوئی نہیں کہ شعار تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قوم کے عادات کا لحاظ کیا جائے جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے۔''[3]

۱- مولانا شبلی مرحوم نے شاہ صاحب کے الفاظ کے جو وسیع معنی قرار دیے ہیں، صحیح نہیں (س)۔

۲- تالیف شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء)۔

۳- الکلام، صفحات ۱۱۴-۱۱۵۔

مہربانی کر کے یہ فرمائیے کہ مندرجہ بالا فقرے میں لفظ شعار سے کیا مراد ہے؟ اور اس کے تحت میں کون کون سے مراسم یا دستور آتے ہیں؟ اس لفظ کی مفصّل تشریح مطلوب ہے۔ جواب کا سخت انتظار رہے گا۔ والسلام

مخلص، محمد اقبال

۴۶

لاہور

۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء

مخدومی! والا نامہ ملا جس کے لیے بہت شکرگزار ہوں۔ لفظ شعار کے معنی کے متعلق پورا اطمینان آپ کی تحریر سے نہیں ہوا۔ کیا کسی جگہ حضرت شاہ ولی اللہ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں شعائر کی یہ تشریح کی ہے جو آپ نے کی ہے؟ دیگر عرض یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ نے اسی فقرہ میں لفظ ارتفاقات استعمال کیا ہے۔ مولانا شبلی نے ایک جگہ اس کا ترجمہ انتظامات اور دوسری جگہ مسلّمات کیا ہے۔ اُردو ترجمے سے یہ نہیں کھلتا کہ اصل مقصود کیا ہے۔ کل سیالکوٹ میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' مطالعے سے گزری۔ اس سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے ارتفاقات کی چار قسمیں لکھی ہیں۔ ان چار قسموں میں تمدنی امور مثلاً نکاح طلاق وغیرہ کے مسائل بھی آ جاتے ہیں۔ کیا شاہ صاحب کے خیال میں ان معاملات میں بھی سخت گیری نہیں کی جاتی؟ میرا مقصد محض شاہ صاحب کا مطلب سمجھنا ہے۔ مہربانی کر کے اسے واضح فرمائیے۔ سنّت پر آپ کا مضمون ضرور دیکھوں گا اور اس سے اپنی تحریر میں فائدہ بھی

آٹھاؤں گا - اس خط کا جواب جلد ارسال فرمائیے -

مخلص محمد اقبال

۴۷

لاہور

۸ - اگست ۱۹۳۳ء

مخدومی ، السلام علیکم

چند ضروری امور دریافت طلب ہیں جن کے لیے زحمت دے رہا ہوں - از راہِ عنایت معاف فرمائیے :

۱- حضرت محی الدین ابنِ عربی[۱] کے ''فتوحات'' یا کسی اور کتاب میں حقیقتِ زمان کی بحث کس کس جگہ ہے ؟ حوالے مطلوب ہیں -

۲- حضراتِ صوفیہ میں اگر کسی اور بزرگ نے بھی اس مضمون پر بحث کی ہو تو اس کے حوالے سے بھی آگاہ فرمائیے -

۳- متکلمین کے نقطۂ خیال سے حقیقتِ زمان یا آن سیّال پر مختصر اور مدلل بحث کون سی کتاب میں ملے گی ؟ امام رازی کی ''مباحث مشرقیہ'' میں آج کل دیکھ رہا ہوں -

۴- ہندوستان میں بڑے بڑے اشاعرہ کون کون سے ہیں ، اور مُلّا محمود جونپوری[۲] کو چھوڑ کر ، کیا اور

۱- مشہور وجودی فلسفی (م ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) -

۲- عہدِ شاہجہان کا مشہور فلسفی (م ۱۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء) - ''شمس البازغہ'' ملا محمود جونپوری کی مشہور تالیف ہے -

فلاسفہ بھی ہندوستانی مسلمانوں میں پیدا ہوئے؟ ان کے اسماء سے مطلع فرمائیے ۔ اگر ممکن ہو تو اُن کی بڑی بڑی تصنیفات سے بھی ۔

امید کہ مزاج بخیر و عافیت ہوگا ۔ والسلام

مخلص ، محمد اقبال

۴۸

لاہور

۴ ستمبر ۱۹۳۳ع

مخدومی ، السلام علیکم

والا نامہ ابھی ملا ہے ، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔ رسالہ 'اتقان فی ماهیۃ الزمان'[۱] آج مل گیا ۔ میں نے اس کے لیے ایک دوست کو ٹونک لکھا تھا ۔ آج مولوی برکات احمد[۲] کو ایک رسالے کے لیے جو اُردو میں ہے ، لکھا ہے ۔ ہندی فلسفی ساکن پھلواری ، مصنفِ تسویلات فلسفہ کا نام[۳] کیا ہے؟ اور کتاب مذکور طبع ہوئی یا نہ؟ اگر نہیں طبع ہوئی تو قلمی نسخہ اس کا کہاں سے دستیاب ہوگا؟

۱- اقبال اکیڈمی کراچی سے شائع ہوگیا ہے ۔

۲- خیر آبادی مکتبِ فکر کے گلِ سر سبد (م یکم ربیع الاول ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ع) ۔

۳- حافظ محمد ظہور الحق محدث (م ۱۲۳۴ھ/ ۱۸۱۸-۱۹ع) : اُن سے تقریباً سو چھوٹی بڑی کتابیں یادگار ہیں ۔ ''تسویلاتِ فلسفہ'' فصیح عربی زبان میں ہے اور اشاعت العلوم حیدر آباد سے شائع ہو چکی ہے ۔

مہربانی کر کے جلد مطلع فرمائیں۔

شرح "مواقف"[۱] دیکھ رہا ہوں۔ "فتوحات"[۲] کا مطالعہ آپ کا ملخص آنے کے بعد دیکھوں گا۔ خدا کرے آپ کی صحت اچھی رہے اور آپ اس طرف جلد توجہ کر سکیں۔ نورالاسلام کا عربی رسالہ بابت مکان، جو رامپور میں ہے، کس زبان میں ہے؟ قلمی ہے یا مطبوعہ؟ نورالاسلام کا زمانہ کون سا ہے؟

اس تصدیع کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔

علومِ اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے؟

دارالمصنفین کی طرف سے ہندوستان کے حکمائے اسلام پر ایک کتاب نکلنی چاہیے۔ اس کی سخت ضرورت ہے۔ عام طور پر یورپ میں سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی فلسفیانہ روایات نہیں ہیں۔ والسلام

مخلص، محمد اقبال

۱- قاضی عضد الدین ایجی (م ۷۵۶ھ/۱۳۵۵ء) نے علم کلام میں "مواقف" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ سید شریف جرجانی (م ۶ ربیع الآخر ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء) نے اس کی شرح لکھی جو شائع ہو چکی ہے۔

۲- "فتوحاتِ مکیہ" ابن عربی (م۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) کی مشہور تالیف ہے۔

۴۹

لاہور

۱۰ ستمبر ۱۹۳۳ء

مخدومی جناب مولانا ، السلام علیکم

ایک عریضہ پہلے ارسال کر چکا ہوں ، اس کے جواب کا انتظار ہے ۔ اس عریضے میں یہ دریافت کرنا بھول گیا کہ ملا محب اللہ بہاری[1] کی کتاب ''جوہر الفرد'' کہاں سے ملے گی ؟

شاہِ افغانستان آپ سے تعلیمِ مذہبی کے بارے میں مشورہ چاہتے ہیں ۔ شاید اسی ماہ ستمبر میں آپ کو کابل سے دعوت آئے ۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ جانے کے لیے تیار ہوں گے ؟ ممکن ہے کہ سید راس مسعود[2] اور اقبال بھی آپ کے ہمراہ ہوں ۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا ۔

جواب کا انتظار ہے ۔

محمد اقبال ، لاہور

۱- مشہور منطقی اور فقیہ (م ۱۱۱۹ھ/۸-۱۷۰۷ء) - ''تذکرۂ علمائے ہند'' کے مؤلف نے محب اللہ بہاری کے بارے میں لکھا ہے : ''بحرے بود از بحار علوم و بدرے بود بین النجوم ۔''

۲- سرسیّد احمد خاں کے پوتے اور علامہ اقبال کے گہرے دوست تھے (م ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء/۱۳۵۶ھ) -

۵۰

لاہور

۱۷ ستمبر ۱۹۳۳ء

مخدومی ، السلام علیکم

آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے جو ہم نے قونصل جنرل صاحب کی خدمت میں بھیج دیا ہے ۔ سید راس مسعود صاحب کی طرف سے ابھی تک جواب موصول نہیں ہوا ہے ۔

حضرت ابنِ عربی کے خیالات و افکار بھیجنے کا جو وعدہ آپ نے فرمایا ، اس کے لیے بے حد شکر گزار ہوں ۔ مولوی سید برکات احمد صاحب کا رسالہ میں نے دیکھا ہے ۔ انشاء اللہ اسے سبقاً سبقاً پڑھوں گا ۔ مسئلۂ آن کے متعلق ابھی تک مشکلات باقی ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفہ پر جو اعتراضات ہمارے متکلمین نے کیے ہیں ، وہ مسئلۂ زمان کے متعلق خود ان کے افکار پر بھی عائد ہوتے ہیں ۔ مولوی سید برکات احمد مرحوم نے دہر اور زمان میں امتیاز کرکے کسی قدر مشکلات کو کم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حق یہ ہے کہ مسئلہ نہایت مشکل ہے ۔ ممکن ہے حضرت ابنِ عربی اس پر روشنی ڈال سکیں ۔

جمعیّت العلما[1] کی صدارت کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے ،

۱- جمعیت علمائے ہند سے اختلاف رکھنے والے علما نے کانپور میں اس جمعیّت کی بنیاد رکھی تھی ۔ مولانا مظہر الدین اس کے جنرل سیکرٹری تھے ۔

بالکل صحیح ہے ۔ مولوی مظہر الدین[1] صاحب نے میرا حوالہ دینے پر اصرار کیا ، اس واسطے میں نے اُن کو اجازت دے دی کہ آپ کو صدارت کے لیے خط لکھیں تو میرا حوالہ دے دیں ۔ میں خود مسلمانوں کے انتشار سے بے حد دردمند ہوں اور گزشتہ چار پانچ سال کے تجربے نے مجھے سخت افسردہ کر دیا ہے ۔ آپ کا طرزِ عمل اختیار کیے بغیر چارہ نہیں ۔

مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے ۔ میں نے آغا خان کو ، باوجود اُن کی تمام کمزوریوں کے ، ان سب سے بہتر مسلمان پایا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدت سے اُن کے مذہبی خیالات میں ایک انقلاب عظیم آ رہا ہے ۔

زیادہ کیا عرض کروں سوائے التماسِ دعا کے ۔ والسلام

مخلص ، محمد اقبال

۵۱

مخدومی جنابِ مولانا ، السلام علیکم

دعوت نامہ ، جو قونصل صاحب کی طرف سے مجھے موصول ہوا ہے ، ارسالِ خدمت ہے ۔ تاریخِ روانگی کے متعلق بعد میں عرض کروں گا ، کیونکہ پاسپورٹ لینے کے لیے بھی کچھ دن لگیں گے ۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا ۔

آج قونصل صاحب کو مزید تفصیلات کے لیے خط لکھ رہا

۱۔ ایڈیٹر سہ روزہ ''الامان'' دہلی (مقتول ۱۳۹۹ع/۱۳۵۸ھ) ۔

ہوں - اُن کا جواب آنے پر پھر خط لکھوں گا - آپ پاسپورٹ کے لیے درخواست کردیں - اس میں اگر یہ لکھ دیا جائے کہ آپ کو شاہِ افغان نے تعلیمی امور میں مشورے کے لیے طلب فرمایا ہے ، تو پاسپورٹ حاصل ہونے میں سہولت ہو اور جلد مل جائے - والسلام

۱۵ - اکتوبر ۱۹۳۳ء مخلص ، محمد اقبال ، لاہور

۵۲

لاہور

۱۹ - اکتوبر ۱۹۳۳ء

جناب مولانا ، السلام علیکم

میں نے آپ کی خدمت میں دعوت نامۂ افغانستان ارسال کیا تھا مگر آپ کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا - امید ہے کہ آپ نے پاسپورٹ کے لیے اپنے ضلع میں درخواست کر دی ہوگی - اگر کوئی ملازم آپ کے ہمراہ جائے گا تو اُس کے لیے علیحدہ درخواست پاسپورٹ کے لیے دینی ہوگی - جب آپ کو پاسپورٹ مل جائے تو مہربانی کرکے مجھے بذریعۂ تار مطلع فرمائیے - پاسپورٹ کی درخواست ایک خاص فارم پر دی جاتی ہے - ساتھ فوٹو بھی دینا پڑتا ہے - اگر کوئی اور امر دریافت طلب ہو تو قونصل جنرل افغانستان ، ۳ - بیلی روڈ ، نیو دہلی سے دریافت کریں - آپ کے مصارف افغان گورنمنٹ ادا کرے گی - پشاور سے آپ شاہی مہمان ہوں گے - جواب جلد دیں - والسلام

مخلص ، محمد اقبال ، لاہور

۵۳

لاہور

۱۱ - اکتوبر ۱۹۳۳ء

جناب مولانا ، السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے - میں نے آپ کو دعوت نامہ ۹ - اکتوبر سے پہلے بھیج دیا تھا - تعجب ہے کہ آپ نے اتنے دنوں بعد پاسپورٹ کے لیے درخواست دی - بہرحال قونصل صاحب نے گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھ دیا ہے کہ آپ کا پاسپورٹ جلد مل جائے - مجھے امید ہے کہ جلد مل جائے گا - اس سے پہلے میں ایک پوسٹ کارڈ لکھ چکا ہوں کہ جب آپ کو پاسپورٹ مل جائے تو فوراً مجھے تار دیں تاکہ تاریخِ روانگی مقرر کی جائے - سیّد راس مسعود کا خط مجھے کل ملا تھا - وہ لکھتے ہیں کہ ۱۹ - اکتوبر کو پشاور سے چلنا چاہیے - میں نے ان کو جواب میں لکھا ہے کہ تاریخِ روانگی (پشاور سے) کی تعیین پاسپورٹ ملنے پر ہونی چاہیے - یہ بھی خیال رہے کہ اگر ملازم ساتھ لے جانا چاہیں تو اس کے لیے پاسپورٹ علیحدہ لینا ہوگا - اکتوبر میں موسم خوش گوار ہوتا ہے - راتیں عام طور پر ایسی ہوتی ہیں جیسے شملہ میں - البتہ نومبر میں سردی کسی قدر بڑھ جاتی ہے - میرے خیال میں سردی کے موسم کے لیے موزوں بستر اور پہننے کے لیے کپڑے لے جانا چاہیے - قونصل صاحب نے بھی یہی لکھا ہے - قونصل خانے کا ایک آدمی ہمارے ہمراہ جائے گا - پشاور سے آپ شاہی مہمان ہوں گے - وہاں آٹھ دس روز سے زیادہ

ٹھہرنے کی شاید ضرورت نہ ہوگی ۔ زیادہ کیا عرض کروں ، امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔ والسلام

محمد اقبال ، لاہور

۵۴

مخدومی مولانا ، السلام

سینڈ راس مسعود اصرار کرتے ہیں کہ لاہور سے ۲۰ ۔ اکتوبر کی صبح کو پشاور کی طرف روانہ ہوں ۔ شام کو پشاور پہنچ جائیں گے ۔ رات بھر وہاں ٹھہر کر ۲۱ کی صبح کو روانۂ کابل ہوں گے ۔ آپ ایسا انتظام کریں کہ یا تو ۲۰ کی صبح کو لاہور پہنچیں یا ۱۹ کی شام کو لاہور پہنچ جائیں ۔ امید کہ آپ کو پاسپورٹ اس سے پہلے مل جائے گا ۔ میرا پاسپورٹ کل مل جانے کی توقع ہے ۔ البتہ ملازم کا دو تین روز بعد ملے گا ۔ زیادہ کیا عرض کروں ۔ امید کہ مزاجِ والا بخیر و عافیت ہوگا ۔

یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ہم ۲۱ کی صبح کو پشاور میں مل جائیں ۔ اگر ہم پہلے پہنچیں گے تو آپ کے لیے آدمی سٹیشن پر بھجوا دیا جائے گا ۔ اس کارڈ کے جواب میں فوراً خط لکھیے تاکہ آپ کے انتظامات کا حال معلوم ہو جائے ۔

۱۳ ۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء

مخلص ، محمد اقبال

۵۵

جناب مولانا ، السلام علیکم

اس سے پہلے ایک کارڈ آپ کی خدمت میں لکھ چکا ہوں اور ایک ملفوف خط بھی لکھ چکا ہوں ۔ پاسپورٹ ۱۹ ۔ اکتوبر سے پہلے ہم سب کو مل جائیں گے ۔ اب فیصلہ یہ ہے کہ ہم ۲۰ ۔ اکتوبر کو لاہور سے صبح کی ٹرین میں پشاور کو روانہ ہوں اور ۲۱ کی صبح کو کابل روانہ ہوں ۔ جلدی اس واسطے ہے کہ نومبر میں وہاں سردی ہو جاتی ہے ۔ سیّد راس مسعود ۱۹ کی شام کو لاہور پہنچ جائیں گے ۔ آپ بھی مہربانی کرکے ۱۹ کی شام کو لاہور پہنچ جائیے ، یا ۲۰ کی صبح کو ایسے وقت پہنچیے کہ آپ ہمارے ساتھ ۲۰ کی صبح کے میل ٹرین میں سوار ہو سکیں ۔ قونصل خانے سے جو آدمی ہمارے ہمراہ جائے گا وہ بھی لاہور ہی سے ساتھ ہوگا ۔ زیادہ کیا عرض کروں ۔ جب ملاقات ہوگی تو مفصّل عرض کروں گا ۔ اس انتظام کے لیے قونصل جنرل صاحب کو اطلاع دے دی ہے ۔

والسلام

مخلص ، محمد اقبال

۱۴ ۔ اکتوبر ۱۹۳۳ ء

۵۶

مخدومی ، آپ کا پوسٹ کارڈ ابھی ملا ہے ۔ میں اس سے پہلے ایک ملفوف خط ارسالِ خدمت کر چکا ہوں ۔ آپ ۱۹ ۔ اکتوبر کی شام کو لاہور پہنچ جائیے ۔ یہاں سے ۲۰ ۔ اکتوبر کی صبح پشاور روانہ ہو جائیں گے ۔ سیّد راس مسعود بھی ۱۹ کی شام کو لاہور پہنچیں

گے ۔ قونصل جنرل صاحب کو بھی آپ تار دے دیں کہ آپ ۱۹ کی شام کو لاہور پہنچ جائیں گے ۔

اگر آپ کو پاسپورٹ ۱۷ کو مل جائے تو مجھے تار دینے کی ضرورت نہیں ۔ قونصل جنرل کو بذریعہ تار مطلع کردیں اور لاہور ۱۹ کی شام کو پہنچ جائیے ۔ والسلام

محمد اقبال

۱۴ ۔ اکتوبر ۱۹۳۳ع

۵۷

جناب مکرم ، السلام علیکم

آپ کا تار کل ملا جس سے معلوم ہوا کہ ۱۷ ۔ اکتوبر تک آپ کو پاسپورٹ نہیں مل سکا ۔ ممکن ہے ۱۸ یا ۱۹ تک مل جائے ۔ ہم یعنی میں، راس مسعود اور میں ۲۰ کی صبح کو لاہور سے روانہ ہوں گے ۔ تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں ۔ اگر آپ ۲۱ کی صبح تک بھی پشاور پہنچ سکیں تو خوب ہے ۔ ڈین ہوٹل میں رات بسر ہوگی ۔ یہ ہوٹل پشاور چھاؤنی کے اسٹیشن سے بالکل قریب ہے ۔ آپ وہیں کے پتے پر ہم کو تار دے دیں ۔ ہم آپ کی گاڑی کا انتظار کریں گے اور اسٹیشن پر آپ کے لیے آدمی بھیج دیا جائے گا ۔ اگر آپ کل شام یا ۲۰ کی صبح لاہور پہنچ سکیں تو ٹکٹ صرف لاہور ہی تک کا خرید کریں ، جیسا کہ میں پہلے تار دے چکا ہوں ۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو ٹکٹ پشاور چھاؤنی اسٹیشن تک کا خرید کریں ۔ آپ کے تمام مصارف ادا کیے جائیں گے ۔ امید کہ آپ بخیریت ہوں گے اور آپ کی معیت

سے ہم سب مستفیض ہوں گے ۔ والسلام

۸ - ۱ کتوبر ۱۹۳۳ء　　　　محمد اقبال ، لاہور

۵۸

لاہور

۱۸ نومبر ۱۹۳۳ء

مخدومی جناب قبلہ مولانا ، السلام علیکم

'معارف' سے معلوم ہوا کہ آپ مع الخیر وطن پہنچ گئے ۔

یہ عریضہ حضرت محی الدین ابن عربی کے مسئلۂ زمان و مکان کی تلخیص کی یاد دہانی کے لیے لکھتا ہوں ۔ مجھے چند روز تک اس کی ضرورت پڑے گی ۔ اس واسطے التماس ہے کہ ادھر جلد توجہ فرما کر مجھے ممنون فرمائیے ۔

شاہ نادر[1] کی شہادت کا قلق ہوا ۔ خدا تعالیٰ اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے ۔ انشاء اللہ افغانستان میں امن و امان رہے گا ۔ میں نے شاہ ظاہر[2] کو تار دے دیا تھا جس کا جواب پرسوں موصول ہوا ۔ صدرِ اعظم صاحب کا تار بھی آیا تھا ۔ اُمید کہ آپ نے بھی اُن کو خیریت کا تار تو دیا ہوگا ، زیادہ کیا عرض کروں ۔

اُمید کہ جناب کا مزاج بخیر ہوگا ۔ والسلام

محمد اقبال

۱- شاہِ افغانستان ۔　　۲- جانشینِ نادر شاہ ۔

۵۹

لاہور

۹ دسمبر ۱۹۳۳ع

مخدومی ، السلام علیکم

عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے[1] ، اُس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا ۔ الحمد للہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف پر ہوا ۔

مولوی نورالاسلام کا رسالہ ''فی تحقیق المکان'' کی نقل رامپور کے کتب خانے سے آ گئی ہے ۔ اب آپ کے ایفائے وعدہ کا انتظار ہے ۔ اُمید ہے کہ آپ ادھر جلد توجہ فرما کر مجھے شکرگزاری کا موقع دیں گے ۔ زیادہ کیا عرض کروں ، امید کہ جناب کا مزاج بخیر ہوگا ۔

والسلام

مخلص ، محمد اقبال

٦۰

لاہور

۱۵ دسمبر ۱۹۳۳ع

مخدومی جناب مولانا ، السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے ۔ تلخیص کے لیے نہایت

۱۔ مکتوب الیہ سید سلیمان ندوی نے ۱۹۳۰ع میں ''خیام'' کے نام سے ایک تحقیقی کتاب لکھی تھی ، اُسی کی طرف اشارہ ہے ۔

شکر گزار ہوں مگر اسے پڑھ کر میرے دل میں ایک خیال یا سوال پیدا ہوا ہے جس کا پوچھنا ضروری ہے۔

اگر دہر ممتد اور مستمر ہے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر مکان کیا چیز ہے؟ جس طرح زمان دہر کا ایک طرح کا عکس ہے اسی طرح مکان بھی دہر ہی کا عکس ہونا چاہیے، یا یوں کہیے کہ زمان و مکان دونوں کی حقیقتِ اصلیہ دہر ہی ہے۔ کیا یہ خیال محی الدین ابنِ عربی کے نقطۂ خیال سے صحیح ہے؟ اس کا جواب، شاید ”فتوحات“ ہی میں ملے۔ مہربانی کر کے تھوڑی سی تکلیف اور گوارا فرمائیے اور دیکھیے کہ کیا انھوں نے مکان پر بھی کچھ بحث کی ہے اور اگر کی ہے تو مکان اور دہر کا تعلق ان کے نزدیک کیا ہے۔ اس زحمت کے لیے معافی چاہتا ہوں اور جواب جہاں تک ہو جلد مانگتا ہوں۔

میں نے زمان و مکان کے متعلق تھوڑا سا مطالعہ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ یہ کام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کو چاہیے کہ اس کام کو اپنی زندگی کے اہم مقاصد میں شمار کریں۔

جواب کا انتظار رہے گا۔ والسلام

مخلص، محمد اقبال

۶۱

لاہور

۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء

مخدومی ، السلام علیکم

دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے - جمہوریت فنا ہو رہی ہے اور اس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ قائم ہو رہی ہے - جرمنی میں مادی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جا رہی ہے - سرمایہ داری کے خلاف پھر ایک جہادِ عظیم ہو رہا ہے - تہذیب و تمدن (بالخصوص یورپ میں) بھی حالتِ نزع میں ہے - غرض کہ نظامِ عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے - ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک مد ہو سکتا ہے ؟ اس مبحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمائیے ، اور اگر کوئی کتابیں ایسی ہوں جن کا مطالعہ اس ضمن میں مفید ہو تو ان کے ناموں سے آگاہ فرمائیے - والسلام

محمد اقبال

۶۲

لاہور

۲۴ جنوری ۱۹۳۴ء

مخدوم و مکرم ، السلام علیکم

کچھ روز ہوئے ایک عریضہ لکھا تھا ، غالباً آپ کی عدیم الفرصتی جواب سے مانع رہی ، اس خط کے جواب کا انتظار ہے -

۱- کل میں آپ کے پرانے خطوط پڑھ رہا تھا جو میرے پاس محفوظ ہیں - ان میں سے ایک خط میں آپ نے لکھا ہے کہ اسلامی ریاست کے امیر کو اختیار ہے کہ جب اُسے معلوم ہو کہ بعض شرعی اجازتوں میں فساد کا امکان ہے تو ان اجازتوں کو منسوخ کر دے ، عارضی طور پر یا مستقل طور پر ، بلکہ بعض فرائض کو بھی منسوخ کر سکتا ہے -[1] اس وقت آپ کا خط میرے سامنے نہیں ہے - حافظے سے لکھ رہا ہوں - کیا یہ بات صحیح ہے ؟ اگر صحیح ہے تو اس کا حوالہ کہاں سے ملے گا ؟ مہربانی کر کے اس کتاب کا پتا دیجیے جس میں یہ مسئلہ درج ہے -

۲- کیا یہ صحیح ہے کہ متعہ (نکاحِ موقّت) حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمانوں میں مروج تھا اور حضرت عمرؓ نے اُسے منسوخ کر دیا ؟ نیز زمانۂ حال کا کوئی امیر بھی کسی امر کی نسبت ایسا فیصلہ کرنے کا مجاز ہے ؟

سفرنامۂ کابل بہت دلچسپ ہے - ممکن ہے آپ کو وہاں ایک دفعہ پھر جانا پڑے -

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہے - والسلام

مخلص ، محمد اقبال

۱- ڈاکٹر صاحب کے حافظے نے غلطی کی ہے - 'ملتوی' کی جگہ 'منسوخ' لکھ گئے ہیں - (س)

۹۳

لاہور

یکم فروری ۱۹۳۸ء

جناب مولانا ، السلام علیکم

۱- آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے جس کے لیے بہت شکر گزار ہوں - میں نے آپ کا پہلا خط پھر دیکھا ہے - آپ نے جو کچھ لکھا ہے درست ہے ، مگر میں ان معاملات کی ایک فہرست چاہتا ہوں جن کے متعلق رائے قائم کرنا 'امام' کے سپرد ہے - جرائم میں ایسے جرم میں جن کی تعزیر غالباً قرآن شریف میں مقرر ہے ، ان کے متعلق امام کیونکر رائے دے سکتا ہے ؟

۲- آپ فرماتے ہیں کہ تواترِ عمل کی ایک مثال نماز ہے - مالکیوں اور حنفیوں اور شیعوں میں جو اختلاف صورتِ نماز میں ہے وہ کیونکر ہوا ؟

۳- ایک اور سوال پوچھنے کی جرأت کرتا ہوں - (۱) احکامِ منصوصہ میں توسیعِ اختیاراتِ امام کے اصول کیا ہیں ؟ (۲) اگر امام توسیع کر سکتا ہے تو کیا ان کے عمل کو محدود بھی کر سکتا ہے ؟ اس کی کوئی تاریخی مثال ہو تو واضح فرمائیے - (۳) زمین کا مالک قرآن کے نزدیک کون ہے ؟ اسلامی فقہا کا مذہب اس بارے میں کیا ہے ؟ قاضی مبارک میں شاید اس کے متعلق کوئی فتویٰ ہے - وہ فتویٰ کیا ہے ؟ (۴) اگر کوئی اسلامی ملک (روس کی طرح) زمین کو حکومت کی ملکیت قرار دے تو کیا یہ بات شرعِ اسلامی کے

موافق ہوگی یا مخالف ؟ اس مسئلے کا سیاست اور اجتماع معاشرت سے گہرا تعلق ہے - کیا یہ بات بھی رائے امام کے سپرد ہوگی ؟ (۵) صدقات کی کتنی قسمیں اسلام میں ہیں ؟ صدقہ اور خیرات میں کیا فرق ہے ؟ تکلیف تو آپ کو ان سوالات کے جواب میں ہوگی مگر مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اس زحمت کے لیے معاف فرمائیں گے -

تعلیمی مشورت کے لیے جو جلسے آپ کے آنے سے پہلے ہوئے اُن کے متعلق کچھ نوٹ سیّد راس مسعود نے لیے تھے - اُن کی خدمت میں ہم دونوں کے علاوہ سردار فیض محمد خان وزیر خارجہ اور افغانی تعلیمی بورڈ کے ممبر اور غالباً ترکی تعلیمی مشیر شامل تھے- سرور خان کے خطوط بھی آئے تھے - والسلام

مخلص ، محمد اقبال

۶۴

لاہور

۶ ستمبر ۱۹۳۴ء

مخدومی مولانا ، السلام علیکم

یہ خط اعظم گڑھ کے پتے پر لکھتا ہوں - معلوم نہیں کہ آپ ابھی علی گڑھ ہی میں ہیں یا وہاں سے واپس آ گئے ہیں - راغب اصفہانی[1] نے ''مفردات'' میں لفظ 'نبی' کی تشریح میں لکھا ہے کہ لفظ 'نبی'

۱- مؤلف ''المفردات فی غریب القرآن'' ، حسین بن محمد بن مفضّل المقلب بہ راغب اصفہانی (م ۵۰۲/۹ - ۱۱۰۸ء) -

کے دو معنی ہیں : خبر دینے والا اور مقامِ بلند پر کھڑا ہونے والا۔ اوّل الذکر نبی ہمزے کے ساتھ اور دوسرا بغیر ہمزے کے۔ اس ضمن میں راغب نے ایک حدیث بھی نقل کی ہے: یعنی حضور رسالت مآب نے فرمایا کہ میں نبی بغیر ہمزے کے ہوں۔ یہ حدیث ''صحاح ستّہ'' میں ہے یا نہیں[1] ؟

قرآن شریف میں جن انبیاء کا ذکر ہے اُن میں کون سے نبی بالہمزہ ہیں اور کون سے بغیر ہمزہ ؟ یا سب کے سب بغیر ہمزہ ہیں ؟[2]

۲- لفظ 'نار'[3] کا رُوٹ عربی زبان میں کیا ہے ؟

۳- لفظ 'نجات'[4] کا رُوٹ کیا ہے اور رُوٹ کی رُو سے اس کے معنی کیا ہیں ؟ غالباً راغب ہی نے لکھا ہے کہ اس کے معنی بلندی کے ہیں۔

نمبر ایک میں جو سوال میں نے لکھا ہے ، وہ بڑا اہم ہے ، کیونکہ اگر قرآنی انبیا یا حضور رسالت مآبؐ نبی بغیرِ ہمزہ ہیں تو لفظ 'نبی' کا انگریزی ترجمہ Prophet ، جس کے معنی خبر دینے والا

۱- یہ حدیث صحاح میں نہیں۔ آپ نے اس لیے نبی کہنے سے منع فرمایا کہ لغت کی رو سے منصبدارِ نبوت کے لیے نبیؐ لفظ ہے نبیءؐ نہیں۔ (س)
۲- یقیناً سب کے سب نبیؐ بلاہمزہ ہیں (س)۔
۳- ''ن و ر'' معلوم ہوتا ہے۔ اس روٹ کے اصلی معنی چمک کے معلوم ہوتے ہیں۔ نور : روشنی ، نار : آگ ، نورہ : چولا ، لورۃ : کلی ، سب اسی ایک مفہوم کے مظاہر ہیں۔ (س)
۴- ''ن ج و'' معنی بلندی کے یعنی جو سیلاب کے وقت پناہ کی جگہ بن سکے۔ اسی سے 'نجوۃ' ہے۔ اسی سے موجودہ 'نجات' ہے۔ (س)

کے ہیں ، کیونکر درست ہو سکتا ہے ؟

اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر و عافیت ہو گا ۔

آپ کا سفرنامۂ افغانستان خوب ہے ۔ لوگوں نے بہت پسند کیا ۔ ہاں ایک ضروری بات یاد آ گئی ۔ یہاں ایک صاحب کے پاس شاہ ولی اللہ کی "تفہیمات ِ الٰہیہ" کی دوسری جلد ہے جو شاہ عاشق حسین[1] (شاگرد ِ شاہ ولی اللہ) کی لکھی ہوئی ہے ۔ کیا ندوہ کے کتب خانے میں یہ کتاب موجود ہے ؟ مولوی نواب صدر یار جنگ[2] کے ہاں جو نسخہ ہے وہ پہلی جلد ہے یا دوسری یا دونوں ؟ کیا کسی نے اس کتاب کے اُردو ترجمے کا انتظام کیا ہے ؟ مجھے ایسا یاد پڑتا ہے کہ شاید 'معارف' میں اس کے اُردو ترجمے کا اعلان کیا گیا تھا ۔

والسلام

مخلص : محمد اقبال

۶۵

بھوپال ، شیش محل

۱۹ جولائی ۱۹۳۵ ع

مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولوی صاحب

السلام علیکم ۔ میں گلے کے برقی علاج کے لیے کچھ مدت کے

۱۔ شاہ محمد عاشق پھلتی (م ۱۱۸۷ھ/۷۴-۱۷۷۳ع) : شاہ ولی اللہ سے کئی رشتے اور تعلق تھے ۔ اُن کے ممیرے بھائی ، نسبتی بھائی ، سمدھی ، رفیق ِ طفلی ، شریک ِ درس اور مسترشد و خلیفہ تھے ۔ (شاہ ولی اللہ اور اُن کا خاندان ، ص ۱۱۸) ۔

۲۔ نواب حبیب الرحمان خان شروانی (م ۱۱ اگست ۱۹۵۰ع/۱۳۶۹ھ) ۔

لیے بھوپال میں مقیم ہوں ۔ اس خط کا جواب یہیں مذکورہ بالا پتے پر عنایت فرمائیے ۔

۱۔ کیا فقہ اسلامی کی رو سے توہین رسول قابل تعزیر جرم ہے؟[1] اگر ہے تو اس کی تعزیر کیا ہے؟[2]

۲۔ اگر کوئی شخص، جو اسلام کا مدعی ہے، یہ کہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی[3] کو حضور رسالت مآب پر جزوی فضیلت حاصل ہے، اس واسطے کہ مرزا قادیانی ایک زیادہ متمدن زمانے میں پیدا ہوئے ہیں، تو کیا ایسا شخص توہین رسول کے جرم کا مرتکب ہے؟ بالفاظ دیگر اگر توہین رسول جرم قابل تعزیر ہے تو عقیدۂ مذکور توہین رسول کی حد میں آتا ہے یا نہیں؟[4]

۱۔ بے شبہ ۔ (س)

۲۔ تعزیر حسب رائے امام، قید سے لے کر قتل تک ۔ (س)

۳۔ قادیانی جماعت کے بانی (م ۲۶ مئی ۱۹۰۸ع/۱۳۲۶ھ) ۔

۴۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی کو جزوی فضیلت حاصل ہونا جائز ہے، اور ایسا کہنا نہ کفر ہے، نہ توہین نبی کا باعث ہے، البتہ مقتضائے محبت کے خلاف ہے ۔ اور پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ یہ جزوی فضیلت حقیقت میں فضیلت کے شمار میں ہے بھی، مثلاً زیادہ متمدن زمانے میں ہونا کوئی فضیلت نہیں کیونکہ خود تمدن نہ کوئی دینی فضیلت ہے، نہ اخلاق، نہ عقلی بلکہ ممکن ہے کہ اس کے بعد اور بھی دنیا زیادہ متمدن ہو جائے تو اس زمانے کے آدمی پر بھی اس زمانے کے آدمی کو فوقیت ہو جائے ۔ اور اگر یہ امر باعث فضیلت ہو تو غلام احمد قادیانی کیا، اقبال سیالکوٹی کو بھی یہ جزوی فضیلت حاصل ہے، بلکہ غلام احمد سے زیادہ، کیونکہ مرزا صاحب نے صرف اس کو دور سے دیکھا ہے، چکھا اور آزمایا نہیں ۔ (س)

۳۔ اگر توہینِ رسول کی مثالیں کتبِ فقہ میں مذکور ہوں تو مہربانی فرما کر ان میں سے چند تحریر فرمائیے ۔ کتاب کا حوالہ بقیدِ صفحہ تحریر فرما کر ممنون فرمائیے ۔[۱]

اُمید ہے کہ اس عریضے کا جواب جلد ملے گا ۔ زیادہ کیا عرض کروں ، میری صحت پہلے سے بہتر ہے ۔ اُمید ہے اس دفعہ کے علاج سے زیادہ فائدہ ہوگا ۔ والسلام

مخلص ، محمد اقبال (لاہور) ، حال وارد بھوپال

٦٦

بھوپال ، شیش محل

یکم اگست ۱۹۳۵ء

مخدوم مکرم جناب مولانا ، السلام علیکم

آپ کا والا نامہ مجھے ابھی ملا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔

چند امور اور بھی دریافت طلب ہیں ۔ اُن کے جواب سے بھی ممنون فرمائیے[۲] ۔

۱۔ تکملۂ "مجمع البحار[۳]" صفحہ ۸۵ میں حضرتِ عائشہؓ کا

۱۔ یہ نقلِ کفر مجھ سے نہ ہوگا ۔ آپ (امام ابنِ تیمیہؒ کی تالیف) "السیف المسلول علی شاتم الرسول" دیکھ لیجیے ۔ (س)

۲۔ اُس وقت وہ ردِ قادیانی پر اپنا مضمون تیار کر رہے تھے ۔ (س)

۳۔ تالیف محمد بن طاہر محدث پٹنی (م : ٦ شوال ۹۸٦ھ/۱۵۷۸ء) فنِ لغت حدیث کی اہم کتاب ۔

ایک قول نقل کیا گیا ہے ، یعنی یہ کہ حضور رسالت مآب ﷺ کو خاتم النبیین کہو ، لیکن یہ نہ کہو کہ ان کے بعد کوئی اور نبی نہیں ہوگا ۔[1]

مہربانی کر کے کتاب دیکھ کر یہ فرمائیے کہ آیا اس قول کے اسناد درج ہیں ؟ اور اگر ہیں تو آپ کے نزدیک ان اسناد کی حقیقت کیا ہے ؟ ایسا ہی قول "درِ منثور[2]" جلد پنجم ، صفحہ ۲۰۴ میں ہے ۔ اس کی تصدیق کی بھی ضرورت ہے ۔[3] میں نے یہاں بھوپال میں یہ کتب تلاش کیں ۔ افسوس اب تک نہیں ملیں ۔

۲۔ "حجج الکرامہ[4]" صفحہ ۴۲۷ - ۴۳۱ (میں) حضرتِ مسیح[4]

۱۔ جی ہاں ! اس کتاب میں یہ روایت ہے جو مصنّف ابنِ ابی شیبہ سے لی گئی ہے لیکن اس کی سند مذکور نہیں جو روایت کی صحت و ضعف کا پتا لگایا جائے ۔ اور اگر صحیح ہو بھی تو یہ حضرت عائشہ کی محض رائے ہے کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے بار بار خود فرمایا ہے "لا نبی بعدی" : میرے بعد کوئی نبی نہیں ۔ حضرتِ عائشہؓ نے اپنے خیال میں اس لیے ایسا کہنے سے منع کیا کہ حضرتِ عیسیٰؑ کے نزول کا انکار اس سے لوگ نہ سمجھنے لگیں ۔ بہرحال یہ اُن کا خیال ہے جس کا صحیح ہونا ضروری نہیں ۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب خود حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے قول کے خلاف ہو ۔ (س)

۲۔ تفسیر قرآن : تالیف جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء) ۔

۳۔ جی ہاں ! وہی روایت بحوالہٗ مصنف ابنِ ابی شیبہ اس کتاب میں بھی ہے اور اس کی نسبت پہلے لکھ چکا ۔ (س)

۴۔ "حجج الکرامہ فی آثار القیامہ" نواب صدیق حسن خاں (م : یکم رجب ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) کی کتاب ہے ۔ (س)

کے دوبارہ آنے کے متعلق ارشاد ہے :

"من قال بسبب نبوتہ کفر حقا" ۔ اس قول کی آپ کے نزدیک کیا حقیقت ہے ؟[1]

۳۔ "لو عاش ابراہیم لکان نبیاً[2] ۔" اس حدیث کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟ نووی[3] اسے معتبر نہیں جانتا ۔ مُلّا علی قاری[4] کے نزدیک معتبر ہے ۔ کیا اس کے اسناد درست ہیں ؟[5]

۱۔ حضرتِ عیسیٰؑ کی آمدِ ثانی بصفتِ نبوت ہوگی یا بلا صفتِ نبوت ؟ اس باب میں علماء کا اختلاف ہے ۔ نواب صاحب کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ بصفتِ نبوت ہوگی ، اس لیے وہ لکھتے ہیں کہ جو لوگ اُن کی آمدِ ثانی میں اُن کی صفتِ نبوت کا انکار کرتے ہیں وہ مرتکبِ کلمۂ کفر ہیں ۔ بہرحال یہ رائے ہے ۔ (س)

۲۔ ابنِ ماجہ ۔ ترجمہ : اگر ابراہیم (ابنِ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) زندہ رہتا تو نبی ہوتا ۔

۳۔ شارحِ صحیح مسلم (م ۶۷۶ھ/۷۸ - ۱۲۷۷ع) ۔

۴۔ مشہور حنفی عالم (م ۱۰۱۴ھ/۶ - ۱۶۰۵ع) ۔

۵۔ یہ ابنِ ماجہ کی روایت ہے ۔ اس روایت کو بعض محققین نے موضوعات میں شمار کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فرضاً ہے ، واقعۃً نہیں ۔ کیونکہ "لو" فرض اور عدمِ وقوع کے لیے آتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا ، اس لیے ابراہیم بن محمد کو بچپن ہی میں اُٹھا لیا گیا ۔ چنانچہ دوسری روایتوں میں بھی یہی مذکور ہے ۔ چنانچہ خود ابنِ ماجہ اور بخاری میں ہے : "و لو قضی ان یکون بعد محمد نبی لعاش ابنہ و لکن لا نبی بعدہ ۔" (ابنِ ماجہ : جنائز ۔ بخاری : انبیاء) یعنی یہ کہ اگر فیصلہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

۴۔ بخاری کی حدیث "و امامکم منکم" میں واؤ حالیہ ہے کیا[1] ؟ اگر حالیہ ہو تو اس حدیث کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے دوبارہ آنے سے مسلمانوں کو کوئی تعلق نہیں، کیونکہ جس وقت وہ آئیں گے، مسلمانوں کا امام خود مسلمانوں میں سے ہوگا۔

۵۔ ختم نبوت کے متعلق اور بھی اگر کوئی بات آپ کے ذہن میں ہو تو اس سے آگاہ فرمائیے۔ زیادہ کیا عرض کروں، امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

مخلص، محمد اقبال

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

الٰہی یہ ہوتا کہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہو تو آپ کے صاحبزادے زندہ رہتے لیکن یہ فیصلۂ الٰہی ہو چکا تھا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ ملا علی قاری نے اس کو موضوعات میں لیا ہے۔ اس کو معتبر نہیں کہا ہے، ضعیف کہا ہے۔ اس میں ابوشیبہ ابراہیم راوی ضعیف ہے بلکہ وہ متروک الحدیث، منکر الحدیث، باطل گو اور دروغ گو تک کہا گیا ہے۔ اس کے بعد بشرطِ صحت "ملا (علی قاری) نے اس کی تاویل کی ہے۔ بہرحال اس حدیث کا وہی مطلب ہے جو اس حدیث کا ہے: "لوکان بعدی نبیّاً لکان عمر" (مسند احمد، ترمذی) یعنی یہ کہ اگر میرے بعد نبی ہونا ممکن ہوتا تو عمر بن خطابؓ نبی ہوتے لیکن چونکہ یہ ممکن نہیں اس لیے نہ وہ اور نہ کوئی اور نبی ہو سکتا ہے۔ (س)

۱۔ صحیح یہی ہے کہ واؤ حالیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ، عیسائیوں پر حجت ہوں گے اور مسلمانوں کی تائید فرمائیں گے۔ مسلمانوں کا امام الگ ہوگا، حضرت عیسیٰ نہ ہوں گے۔ (س)

٦٧

بھوپال

۲۰ - اگست ۱۹۳۵ء

مخدومی ، السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔ میں بھی یہاں حمیدیہ لائبریری اور بعض پرائیویٹ احباب سے کتابیں منگوا کر دیکھتا رہا ۔ الحمدللہ کہ بہت سی باتیں مل گئیں ۔ اس مطالعے سے مجھے بے انتہا فائدہ ہوا اور آپ کے خط نے تو اور بھی راہیں کھول دی ہیں ۔

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا ۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں ۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی ۔ ہاں بعض مقاصدِ خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ :

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست
کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست (زبورِ عجم)

مخلص ، محمد اقبال

٦٨

بھوپال

۲۳ - اگست ۱۹۳۵ء

مخدوم مکرم جناب مولانا ، السلام علیکم

ایک عریضہ لکھ چکا ہوں ، امید کہ پہنچ کر ملاحظۂ عالی سے گزرا ہوگا -

ایک بات دریافت طلب رہ گئی تھی جو اب عرض کرتا ہوں - کیا علمائے اسلام میں کوئی ایسے بزرگ بھی گزرے ہیں جو حیات و نزولِ مسیح ابنِ مریم کے منکر ہوں ؟ یا اگر حیات کے قائل ہوں تو نزول کے منکر ہوں ؟ معتزلہ کا عام طور پر اس مسئلے میں کیا مذہب ہے[۱] ؟

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا - میں ۲۸ - اگست کی شام کو رخصت ہو جاؤں گا - علاج کا کورس اس روز صبح ختم ہو جائے گا - اس خط کا جواب لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیے - والسلام

مخلص ، محمد اقبال

۱- مجھے جہاں تک علم ہے ، نزولِ مسیح کا انکار کسی نے نہیں کیا - معتزلہ کی کتابیں نہیں ملتیں جو حال معلوم ہو - البتہ ابنِ حزم (م ۴۵۶ھ) وفاتِ مسیح کے قائل تھے ، ساتھ ہی نزول کے بھی - (س)

۶۹

لاہور
۳ - اگست ۱۹۳۶ء

مخدومی مولانا ، السلام علیکم

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے اپنے فضل و کرم سے آپ کو صحت عطا فرمائی - آپ کا وجود ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے از بس ضروری ہے اور مجھے یقین ہے کہ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشا ہے تاکہ وہ دیر تک آپ کے علوم سے مستفیض ہوتے رہیں -

میں نے سنا ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "بدور البازغہ" چھپ گئی ہے - مہربانی کر کے اُس کا ایک نسخہ وی - پی مجھے ارسال فرمائیے - اگر آپ کے ہاں نہیں ہے تو مہربانی کر کے جہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے وہاں سے منگوا دیجیے ، یا اُن کو لکھ دیجیے کہ ایک نسخہ میرے لیے وی - پی کر دیا جائے - مجھے معلوم نہیں کہاں چھپی ہے اور کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے ، اس واسطے آپ کو تکلیف دی گئی ہے -

موسیٰ جار اللہ کو آپ جانتے ہوں گے - اُنھوں نے حال میں ایک کتاب عقائدِ شیعہ پر شائع کی ہے - اس میں بعض لطائف ہیں جو بہت جاذبِ توجہ ہیں - والسلام

مخلص ، محمد اقبال

۷۰

لاہور

۷ - اگست ۱۹۳۶ء

مخدومی : السلام علیکم والا نامہ ابھی ملا ہے ۔ آپ کی صحت کی خبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی ۔ خدا تعالیٰ آپ کو دیر تک زندہ و سلامت رکھے ۔ میری صحت کی حالت بہ نسبت سابق بہتر ہے ، گو آواز میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی ۔ انشاء اللہ موسم سرما میں وہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کروں گا جس کا وعدہ میں نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے[1] ۔ اس میں آپ کے مشورے کی ضرورت ہے ۔ ''بدور البازغہ''[2] بھی اسی مقصد کے لیے منگوائی ہے ۔ اس کتاب میں زیادہ تر قوانینِ اسلام پر بحث ہوگی کہ اس وقت اسی کی زیادہ ضرورت ہے ۔ اس کے متعلق جو جو کتب آپ کے ذہن میں ہیں ، مہربانی کر کے اُن کے ناموں سے مجھے آگاہ فرمائیے ، اور یہ بھی فرمائیے کہ کہاں کہاں سے دستیاب ہوں گی ۔

الحمد للہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں مگر حال کے روشن خیال علما کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے ۔ اگر آپ کی صحت اجازت دے تو آپ بھی اس پر ایک جامع و مانع بیان شائع

۱- علامہ یہ کتاب مکمل نہ کر سکے ۔ اُن کے کاغذات سے کچھ نوٹس ملے ہیں ۔ ملاحظہ ہو Letters and Writings of Iqbal ، مرتبہ بشیر احمد ڈار ۔

۲- تصنیف شاہ ولی اللہ دہلوی ۔

فرمائیے ۔ میں بھی تیسرا بیان انشاء اللہ جلد لکھوں گا ۔ اس کا موضوع ہوگا 'بروز' ۔ لفظِ 'بروز'[1] کے متعلق اگر کوئی نکتہ آپ کے ذہن میں ہو ، یا کہیں صوفیہ کی کتابوں میں اس پر بحث ہو تو اس کا پتا دیجیے ، نہایت شکرگزار ہوں گا ۔

موسیٰ جار اللہ صاحب[2] کی کتاب نہایت عمدہ ہے ۔ ملنے کا پتا کتاب پر یہ لکھا ہے :

مکتبۂ الخانجی ، شارع عبدالعزیز ، مصر

امید کہ مزاجِ والا بخیر و عافیت ہوگا ۔ والسلام

مخلص ، محمد اقبال

۷۱

جاوید منزل ، لاہور

۱۹ مئی ۳۷ء

مخدوم و مکرم جناب مولانا صاحب

السلام علیکم ۔ امید کہ آپ کی صحت بالکل اچھی ہوگی ۔

'معارف' کے اس مہینے کے پرچے میں آپ نے 'شذرات' میں چند عربی کتابوں کا ذکر کیا ہے جو حال میں چھپی ہیں ۔ ان میں سے ایک خراج پر ہے ، ایک اموال پر اور تیسری کسی اور مضمون پر جو اس وقت ذہن سے اتر گیا ہے ۔ مجھ کو ان تینوں کتابوں کی

۱- لفظ 'بروز' کے معنی تو ظہور ہیں مگر اس کے اصطلاحی معنی ملاحدۂ عجم کی پیداوار ہیں ۔ (س)

۲- مشہور روسی عالم و مفکر (م ۱۹۴۹ء) ۔

ضرورت ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے یہ کتابیں مصر سے، یا جس جگہ شائع ہوئی ہیں، ندوہ کی معرفت منگوا دیں؟ قیمت ادا کر دی جائے گی۔ قاضی ابویوسف[1] کی کتاب ''خراج'' مجھ کو لاہور سے لائبریری میں مل جائے گی۔ باقی تین کتابیں یہاں نہیں ملتیں۔ مہربانی فرما کر اس خط کا جواب جلد مرحمت فرمائیں۔

شاہ ولی اللہ کی کتاب ''تفہیماتِ الٰہیہ'' میں نے ڈابھیل سے منگوالی ہے۔ اس کتاب سے مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ آپ کی رائے اس کی نسبت کیا ہے؟ والسلام

محمد اقبال

☆ ☆ ☆

۱۔ (م ۱۸۲ھ/۷۹۸ء) شاگردِ امام ابوحنیفہؒ، عہدِ ہارون الرشید میں قاضی القضاۃ تھے۔

ضمیمے

۱۔ سفرِ لاہور کی یادیں ۔

۲۔ برِصغیر کی فکری تحریکوں میں اقبال کا حصہ ۔

۳۔ علامہ اقبال کا سفرِ افغانستان ۔

۴۔ ادارۂ معارفِ اسلامیہ ، لاہور ۔

۱

سفرِ لاہور کی یادیں

وسط اپریل ۱۹۲۷ء میں سید صاحب، انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے لاہور آئے۔ واپس جا کر ماہنامہ 'معارف' میں مندرجہ ذیل 'شذرات' لکھے۔ (مرتب)

پچھلے دس برسوں میں میں نے ہندوستان کا گوشہ گوشہ چھان ڈالا مگر یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ پنجاب جانا اس عرصے میں نصیب نہ ہوا۔ پنجاب کے احباب نے بارہا تقاضا کیا اور اصرار کیا لیکن مجبوریاں تعمیل سے مانع رہیں۔ حمایتِ اسلام لاہور کے کارفرما ہر سال یاد فرماتے رہے مگر عدمِ تعمیل کے لیے ہر سال کوئی نہ کوئی حیلہ ہاتھ آتا رہا۔ امسال مزید بہانہ جوئی کے لیے کوئی چیز ہاتھ نہ آئی اور وسط اپریل میں لاہور جانا ہوا۔

لاہور آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد گیا تھا اور پھر اب گیا۔ اسی لیے انجمن کی تقریر میں میں نے

کہا: ''لاہور پہلے اُس وقت آیا تھا جب میرا آغازِ شباب تھا اور پھر اب آیا ہوں جب انجامِ شباب ہے کہ عمر کا توسن مرحلۂ اربعین سے بھی دو تین قدم آگے بڑھ گیا ہے۔'' انجمن میں میری تقریر کا موضوع ''عہدِ رسالت میں اشاعتِ اسلام'' تھا۔ تقریر کا خلاصہ بعض اخبارات میں چھپ چکا ہے۔

لاہور ہندوستان کا صدر دروازہ ہے، وہاں کی حرکت و جنبش، چہل پہل، رونق و گرم بازاری، جوش و خروش، ہر چیز دلوں کے عزم اور ہاتھ پاؤں کی قوت کو ظاہر کرتی ہے۔ حمایتِ اسلام اس وقت نہ صرف پنجاب بلکہ تمام ہندوستان کی اسلامی انجمنوں میں سب سے زیادہ باعمل اور کارکن جماعت ہے۔ نقائص اور کمزوریوں پر نہ جائیے کہ ان سے تو کوئی انسانی کام کبھی خالی نہیں رہ سکتا۔ جو اس نے نہیں کیا، اُس کا گلہ کیجیے مگر جو اُس نے کیا ہے، اُس کا شکریہ بھی ادا کیجیے۔ اس وقت وہ ایک بڑا کالج، چند ہائی اسکول، متعدد پرائمری اسکول، زنانہ مدرسے اور ایک یتیم خانہ چلا رہی ہے۔ اس کے اردو اور فارسی نصاب کی کتابوں نے تمام ملک میں مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ تبلیغ کا صیغہ بھی اس میں ہے۔ اور بھی رفاہِ عام کے کام وہ انجام دے رہی ہے۔ اس کا آغاز چند محنتی اور غریب عملی مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہوا، اور اب وہ امراء اور ذی اثر اشخاص کے حصولِ عزت کا سامان ہے، یہی اس کی کامیابی کی بڑی دلیل ہے۔

"تمام مسلمانانِ پنجاب عموماً اور مسلمانانِ لاہور خصوصاً مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ ہر سال اس کے کاموں کے لیے ہزارہا روپے فیاضی کے ساتھ دیتے ہیں۔ امسال اس کے کالج کا یا خود اس کا میزانیہ (بجٹ) دس لاکھ کا تھا۔ اس میں پانچ لاکھ کی کمی تھی جس کا قوم سے مطالبہ تھا۔ جلسے میں شاید پچیس تیس ہزار کا چندہ ہو گیا ہوگا۔ گو یہ رقم اس کے مطالبے سے بہت کم ہے تاہم آج کل جب آل انڈیا مجلسوں سے لے کر معمولی مجالس تک کے سالانہ جلسے صرف اسی کو کامیابی سمجھتے ہیں کہ جلسوں میں حاضرین کی کافی تعداد آ جائے، سالہا سال سے ہر طرف سے ادبی، تعلیمی اور مذہبی جلسے چندوں کی بکثرت سے تھک کر خاموش ہو گئے ہیں، اس لیے اس قدر رقم کا جمع ہو جانا بھی ہمارے لیے تعجب کا باعث ہوا۔ یہ بات دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انجمن کے ارکان اور ہمدرد اس موقع پر یا خود کچھ دیتے ہیں یا اپنی محنت سے دوست احباب سے وصول کر کے کچھ لاتے ہیں۔

اس کے ماننے میں کسی کو کبھی تأمل نہ ہوگا کہ مدت سے لاہور اردو مطبوعات اور اخبارات اور رسائل کا مرکز ہے۔ اب تو اور صوبوں نے بھی یہ کام شروع کیا ہے مگر حق یہ ہے کہ نصف صدی تک صرف لاہور نے تنہا اس خدمت کو انجام دیا ہے اور اب بھی وہ سب سے آگے ہے، اور بھلا بُرا جو کام بھی اس سے بن آیا، اس نے کیا اور دوسروں کے لیے تقلید کا نمونہ پیش کیا۔

اصحابِ علم اور اربابِ ادب کی جمعیت کے لحاظ سے بھی وہ

آج کل ہندوستان کی سب سے بہتر مجلس ہے۔ ڈاکٹر سر اقبال ، شیخ عبدالقادر ، پرنسپل عبداللہ یوسف علی ، پروفیسر محمود شیرانی ، پروفیسر اقبال ، پروفیسر محمد شفیع ، پروفیسر سراج الدین آذر ، مولوی محمد علی ایم ۔ اے ، خواجہ کمال الدین ، پروفیسر سیّد عبدالقادر ، مولوی ظفر علی خان اور متعدد ایسے باکمال اصحاب کی سکونت کا اس کو فخر حاصل ہے جن کے یکجا مرقع کی مثال کسی اور شہر میں نظر نہیں آتی ۔ پرانے لوگوں میں سیّد ممتاز علی صاحب ، منشی محبوب عالم اور مولوی انشاء اللہ خان اپنی بہاریں گزار چکے ، تاہم اُن کی خزاں بھی بہار کی یادگار ہے ۔

انشاپردازوں ، ادیبوں اور شاعروں کی محفل بھی وہاں کچھ کم پُررونق نہیں ۔ سالک ، مہر ، تاجور ، ابوالاثر حفیظ ، غلام ربّانی ، تاثیر ، حکیم یوسف حسن (نیرنگِ خیال) ، مولانا عبداللہ ، سیّد امتیاز علی تاج ، اختر شیرانی (بہارستان) اور کئی متعدد اہلِ قلم آگے بڑھنے کے لیے مصروفِ عمل ہیں اور مستقبل ان کی کامیابی کا منتظر اور ان کے خیرمقدم کو تیار ہے ، اور ان میں سے بعض تو آگے بڑھ کر پہلی صف کے قریب پہنچ چکے ہیں ۔

یہ لکھنے میں میرا دل خوشی اور مسرت سے لبریز ہے کہ لاہور کے اہلِ علم اور اہلِ قلم طبقے نے اپنی برادری کے اس کمترین ممبر کو خوش آمدید کہنے میں پوری فیاضی کا ثبوت دیا ۔ مولوی ظفر علی خان نے تو اپنے گھر مہمان ہی اُتارا ، اور یہ نامناسب

بھی نہ ہوا ، کہ ایک "دہقانی ، ایک زمیندار" کا مہمان بنا ۔ ڈاکٹر اقبال سے یہ میری پہلی ظاہری ملاقات تھی ، اور مراسلت کی باطنی ملاقات تو ۱۹۱۴ع سے قائم ہے ، ڈاکٹر صاحب نے کرم کیا کہ ملنے میں پیش دستی فرمائی ۔ قیام گاہ میں آئے ، متعدد صحبتوں میں ساتھ رہے اور پھر خود اپنے کاشانے میں مدعو کیا ، جس کو وہ "دارالفقر" اور میں "دارالاقبال" کہوں گا ۔

مولانا تاجور نے اپنے ہاں چند ہندو مسلمان نوجوان ادیبوں کو میری عزت افزائی کے لیے چائے پر بلایا ۔ پروفیسر آذر نے چند عشاقِ کتب کو مجھے اپنا قلمی کتب خانہ دکھانے کے بہانے سے یکجا کیا ۔ خواجہ سلیم الدین صاحب نے ممتاز اہلِ علم اور نوجوان دل دادگانِ فن کو اپنے "خوانِ نعمت" پر جمع کیا اور ایک غریب الدیار کی عزت بڑھائی ۔ خضرِ نسواں مولوی سیّد ممتاز علی صاحب نے ، جو "تہذیبِ" قدیم و جدید کے مجموعہ ہیں ، اپنے ادب کدہ میں یاد فرمایا ۔

افسوس ہے کہ وقت کی قلّت کے سبب سے میں وہاں کے مشہور کتب خانوں کو نہ دیکھ سکا ۔ وہاں کی پبلک لائبریری اور یونیورسٹی لائبریری کی بڑی تعریف سنی ہے ، تاہم قلمی کتابوں کے دو بڑ کے ذخیرے دیکھے ۔ پہلا ذخیرہ پروفیسر سراج الدین آذر کے شوق اور محنت کا نتیجہ ہے ۔ کئی سو قلمی کتابیں ہوں گی اور

یہ کُل کی کُل صرف پنجاب کے حدود کے اندر سے جمع کی گئی ہیں۔ اس ذخیرے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف فارسی کتابیں ہیں؛ فارسی تذکرے، دواوین، مثنویاں، تاریخیں، بیاضیں اور اسی قسم کی چیزیں ہیں۔ فارسی ادبیات کا اتنا بڑا نادر ذخیرہ شاید کتب خانۂ حبیب گنج (نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی کا کتب خانہ) کے سوا اور کہیں نہ ہوگا۔ کتب خانۂ حبیب گنج میں بھی شاید اتنے دواوین اور مثنویاں اور نظموں کے مجموعے ہوں تو ہوں مگر اتنے تذکرے اور تاریخیں نہ ہوں گی۔ میں نے اس کا نام "آذر کدہ" تجویز کیا۔ پروفیسر آذر کا بیان ہے کہ یہ کُل کمائی چند سال کی ہے۔ وہ کالج کی چھٹیوں میں باہر نکل جاتے ہیں اور چند دنوں کی محنت میں اچھا خاصا شکار مار لاتے ہیں۔ مزید یہ ہے کہ وہ خود ہی ان میں سے زخمی اور مجروح کتابوں کی مرہم پٹی بھی کرتے ہیں۔

دوسرا ذخیرہ خواجہ سلیم الدین کے پاس نظر آیا۔ کتابیں ایک ٹرنک میں تھیں۔ زیادہ تر عربی کی، بعض فارسی کی اور ایک دو اردو کی تھیں۔ عربی کتابوں میں علم النفس (سائیکالوجی) پر چند رسائل کا نادر مجموعہ دیکھا، جس میں ایسے مباحث معلوم ہوئے جو اب تک اس موضوع کی عربی کتابوں میں نظر نہیں آئے تھے۔ مصنف کا نام نہیں ہے۔ فارسی کتابوں میں "رباعیاتِ خیام" کا نسخہ ۸٦۸ھ کا لکھا ہوا تھا جو رباعیات کے بوڈلین لائبریری والے سب سے پرانے نسخے کے دو برس بعد لکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر اقبال ان تمام صحبتوں میں شمعِ محفل تھے - آنھوں نے تو ”شمع اور شاعر“ لکھا ہے ، لیکن میں نے تو لاہور میں خود شاعر کو ”شمع“ دیکھا اور قدرشناسوں کو آس کا پروانہ پایا - آن کی صحبت لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بلند کر رہی ہے - ان کے فلسفیانہ نکات ، عالمانہ افکار ، شاعرانہ خیالات ان کی آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہیں - آن کی ”زمزمہ پردازیوں“ کا نیا مجموعہ ”زبورِ عجم“ کے نام سے عنقریب سامعہ نواز ہونے والا ہے - میں نے کہا کہ فلسفۂ عجم کے دشمن کو مناسب بھی یہی تھا کہ عجم کے ہاتھ میں زبور دے کر ان کے خیالی فلسفے کو مزامیرِ داؤد کی دعاؤں سے بدل دے اور ان کے کانوں کو زبور کا ”پردہ“ رکھ کر قرآن کی نغمہ سنجیوں سے مانوس کر دے -

(معارف ، مئی ۱۹۲۷ء)

☆ ☆ ☆

۲

برصغیر کی فکری تحریکوں میں اقبال کا مقام

''معارف'' جولائی ۱۹۴۳ء کے اداریے (شذرات) میں سید سلیمان ندوی نے برصغیر کی فکری تحریکوں کی غایت و مقصود پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ کا ذکر کیا بھی ہے۔ یہ شذرات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ (مرتب)

مسلمانوں میں جو ذہنی انقلاب پیدا ہو رہا ہے، باوجود طریقِ اظہار، خیال و تعبیر کے اختلاف اور تعدد کے ان میں یک رنگی اور یکسانی نمایاں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں میں اس انقلاب کا بیج مولانا ابوالکلام اور اُن کے 'الہلال' نے بویا تھا۔ ان کی اصطلاحِ توحید کی تعبیر یہ تھی کہ ایک کے آستانے پر سر رکھ کر ہر چوکھٹ سے بے نیاز ہو جانا۔ خلافت کی تحریک کے زمانے میں خلافتِ الٰہی کی تعبیر مختلف طریقوں سے کی گئی مگر بالآخر اس کا منشا یہ تھا کہ نوعِ انسان اس خلافت سے سرفراز رہے اور اس خلافت کے فرض کا ادا کرنا دین ہے اور خلیفہ اس دین کا انتظامی مرکز و

امام ہے - مولانا محمد علی مرحوم نے اسی کنگڈم آف گاڈ کی فلاسفی پیدا کی اور اس پر وہ ایک مستقل تصنیف اپنے زمانۂ قید میں لکھنا چاہتے تھے ، اور کئی سو صفحے لکھے بھی ، مگر اُن کی آپ بیتی کی تمہید اتنی پھیلی کہ جگ بیتی کی نوبت نہ آئی ، تاہم یہ اُن کی تقریروں کا موضوع برابر رہا -

---

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے ۱۹۱۵ء و ۱۹۱۶ء میں خودی و بے خودی کے اسرار فاش کیے اور مسلمِ کامل اور مردِ غازی کے وہ فلسفیانہ اصول بتائے جس سے ایمانِ کامل ، یقینِ محکم اور عملِ پیہم پیدا ہو ، جس سے مسلم قوم کی دینی و سیاسی زندگی تکوین پائے اور اس کو روئے زمین کی امامت اور پیشوائی کا درجہ حاصل ہو - اور یہ ثابت کیا کہ اسلام وطنیت کی حدبندی سے آزاد اور ایک ایسی حقیقت ہے جو بجائے خود مستقل اور دوسروں کی دست نگری اور آمیزش سے پاک ہے - اسلامی خلافت وہ ہے جو اپنے دست و بازو سے حاصل کی جائے ، نہ کہ جس کی دوسروں سے بھیک مانگی جائے - اور یہ کہ ہندوستان میں مسلمان ایک مستقل قوم ہیں جن کے خصوصیات ، امتیازات اور تعمیری مقاصد دوسری قوموں سے بالکل الگ ہے -

---

مشرقی صاحب نے 'تذکرہ' لکھا جس میں لغویات کو حذف کر کے اگر دیکھا جائے تو منشا وہی استخلاف فی الارض کا حصول اور اس کے حصول کے اُصول ہیں ، اور اسی پر خاکسار تحریک کی بنیاد

رکھی ہے ، مگر چونکہ اس کا بانی دین کے اصول و مبادی سے واقف نہ تھا اس لیے حق و باطل کی آمیزش سے اس کو دوچار ہونا پڑا ۔

ہمارے مشہور سفکتر دوست مولانا آزاد سبحانی بھی یورپ کے شہروں میں دعوتِ کلمہ کے نام سے ایک تحریک عرصے سے چلا رہے ہیں جس میں خدائے برحق کی بادشاہی کے سوا ہر بادشاہی کا ابطال ہو اور اسی واحد کلمہ کو وہ سیاسیات اور دینیات کا عظیم الشان سنگم قرار دے کر اپنے پورے فلسفۂ تعلیم کا مرکز ٹھہراتے ہیں ۔

چند سال سے مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے جس جماعتِ اسلامی کی بنا رکھی ہے اور اُس کے متعلق جو اصول و مبادی اُنھوں نے تحریر فرمائے ہیں ، ان سب کا منشا بھی خلافتِ اسلامی اور حکومتِ الٰہی کو مرکز قرار دے کر پورے اسلام کو ایک عظیم الشان تحریک ٹھہرانا ہے ، جس کی دعوت لے کر مسلمان پھر کھڑے ہوں ۔

کلکتے میں صوفی نذیر احمد صاحب اسی کام کو مسلم لیگ کے زیرِ سایہ اور مسٹر محمد علی جینا کے زیرِ قیادت انجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ اجلاسِ دلّی کے موقع پر گیارہ مسلمان لیڈروں کے دستخط سے ایک اعلان شائع کیا ہے جس میں دو تجویزیں پیش کی ہیں : ان میں سے اوّل تعمیرِ ملّی کے لیے ایک مرکزی مجلس کا قیام ہے جس کے ذریعے سے مسلم لیگ کی تجویزِ پاکستان کی ایسی تشریح کی جائے

جس سے مسلم سوسائٹی ، مسلم نظامِ معاشیات ، ملّی سیرت و تعلیم ، تہذیب و تمدن کی اسلام کے اساسی اصولوں کے مطابق اصلاح و ترقی کی تحریکات کی اس طرح ہدایت و راہنمائی کی جائے کہ اُن کے ذریعے ایک حقیقی اسلامی اسٹیٹ اور ہیئتِ اجتماعی کی تجدید کا نصب العین حاصل ہو سکے ۔

تجویزِ دوم کا مقصد یہ ہے کہ لیگ کا شعبۂ اسلامیات و اصلاحِ تمدن و معاشرت یا شعبۂ تبلیغ و اصلاح و تربیتِ دین قائم کیا جائے جس سے مسلمانوں کی روحانی و اخلاقی نشاۃِ جدیدہ کے لیے تبلیغِ عام اور تعلیمِ عام (ماس ایجوکیشن) اور معاشرتی اصلاحات کی تحریکات اس طرح جاری ہوں کہ اسلام کے بنیادی اصول و تعلیمات پر عوام کا شعوری ایمان پختہ اور عمل راسخ ہو جائے ۔ ہم کو معلوم نہیں کہ دلّی میں ان تجویزوں کا کیا حشر ہوا ، تاہم مسلمانوں کے اس ذہنی انقلاب کا ایک مظہر یہ بھی ہے ۔

خود مسلم لیگ کے اندر پاکستان کی سیاسی حقیقت کی تعبیر میں اس کے مذہبی و روحانی عنصر کا رجحان روز بروز بڑھتا جاتا ہے اور اسلامی نظامِ حکومت ، نظامِ معاش ، نظامِ اقتصاد اور نظامِ تعلیم کے خاکوں کی طرف ذہن خود بخود منتقل ہوتا جا رہا ہے ۔

ابھی حال میں علی گڑھ اور لکھنؤ کے امتزاج سے ایک نئی اسلامی جماعت کے قیام کی اطلاع مل رہی ہے جس میں مسلم یونیورسٹی

کی مجلسِ اسلامیات اور جناب راجہ صاحب محمود آباد کے اتحاد سے اسلامی تعلیم و تمدن کے احیا کی تجویزیں منظور کی گئی ہیں ، اور اس مجلس کی وسعت کو پورے ملک میں پھیلانے کا عزم ظاہر کیا گیا ہے جس میں سنّی اور شیعہ دونوں شریک ہوں۔

ان تجویزوں سے ، جو مختلف حلقوں سے نکلی ہیں اور مختلف بانیوں اور مجوزوں کی طرف منسوب ہیں ، اس بازگشت کا اندازہ ہوتا ہے جو یورپ کی تقلیدِ عام کے پرانے تخیّل کی جگہ لے رہی ہے اور جس کا ہم بڑی خوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔ جزئی اختلافات سے قطع نظر کر کے یہ بات دیکھنے کی ہے کہ گذشتہ تحریکوں کی طرح اس کی بنیاد فوری جوش و خروش اور ہنگامی زود اشتعالی پر نہیں ہے بلکہ آہستہ آہستہ ایک صحیح عقیدہ اور آئیڈیالوجی پیدا ہو رہی ہے ، جو ایک دن اُمید ہے کہ صحیح راستہ پائے گی اور اس کی بنیاد پر عمل کا جو خاکہ تیار ہوگا وہ سارے افرادِ ملّت کو دین و سیاست کے باہمی ربط و ضبط پر اُستوار کر کے اُس کے حصول کے لیے اُن میں نئے جوش ، نئے عزم اور ایثار و قربانی اور جد و جہد کے جذبات پیدا کر دے گا ، انشاء اللہ تعالیٰ۔ لیکن صرف اتنی ترمیم یاد رکھی جائے کہ سیاست کو دین کا درجہ نہ دیا جائے ، یعنی دعوت کا مقصد حصولِ دنیا نہ ہو بلکہ رضائے الٰہی کی طلب ہو جس کی وسعت میں دین و دنیا کی سعادتیں جمع ہیں۔

☆ ☆ ☆

۳

علامہ اقبال کا سفرِ افغانستان

مرتّب کا یہ مضمون پہلی بار ''اقبال ریویو'' (لاہور) میں شائع ہوا تھا ۔ اقبال اکیڈمی لاہور کے شکریے کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے (مرتّب) ۔

۱۹۳۳ء میں شاہِ افغانستان اعلیٰ حضرت نادر شاہ نے بعض مذہبی اور تعلیمی امور کے متعلق مشورے کے لیے برصغیر کے تین دانشوروں ــــ علامہ اقبال ، راس مسعود اور سیّد سلیمان ندوی ــــ کو افغانستان آنے کی دعوت دی ۔ علامہ اقبال کی وساطت سے راس مسعود اور سیّد سلیمان ندوی کو قونصل جنرل کا باضابطہ دعوت نامہ بھیجا گیا ۔ قونصل جنرل کی خواہش تھی کہ یہ تینوں بزرگ ۱۳۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء کے جشنِ استقلال کے موقع پر کابل پہنچ جائیں ، مگر اس قدر جلد پاسپورٹ کا ملنا ممکن نہ تھا اور جب تک پاسپورٹ نہ حاصل ہو جاتا ، روانگی کی تاریخ کا حتمی تعیّن نہیں ہو سکتا تھا ۔ چنانچہ جب ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو علامہ صاحب اور راس مسعود کو پاسپورٹ مل گیا تو ۲۰۔ اکتوبر کو لاہور سے اور ۲۱۔ اکتوبر کو

پشاور سے روانگی کا پروگرام بن گیا ۔ علامہ اور راس مسعود اسی پروگرام کے مطابق لاہور سے پشاور روانہ ہوئے اور سفر شروع کردیا ۔ رات ''ڈین ہوٹل'' میں بسر کی ۔ یہ ہوٹل پشاور چھاؤنی کے بالکل قریب ہے ۔ سیّد سلیمان ندوی کے پاسپورٹ ملنے میں دیر تھی ، اس لیے وہ پشاور بھی اپنے ساتھیوں سے نہ مل سکے ۔ آخر ۲۳ اکتوبر کو لکھنو سے اور ۲۵ کو پشاور سے روانہ ہوئے ۔

علامہ نے اس سفر پر روانہ ہونے سے پہلے درجِ ذیل اخباری بیان دیا :

''تعلیم یافتہ افغانستان ہندوستان کا بہترین دوست ہوگا ۔ کابل میں ایک نئی یونیورسٹی کا قیام اور ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں اسلامیہ کالج پشاور کو ایک دوسری یونیورسٹی میں تبدیل کرنے کی سکیم ہندوستان اور افغانستان کے درمیانی علاقے میں بسنے والے ہوشیار افغان قبیلوں کی سدھار میں بہت زیادہ ممد ثابت ہوگی ۔

''شاہِ افغانستان نے ہمیں اس لیے دعوت دی ہے کہ ہم وہاں کے وزیرِ تعلیم کو کابل میں یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں مشورہ دیں ۔ اعلیٰ حضرت کی دعوت کو قبول کرنا ہم نے اپنا فرض سمجھا ۔ کابل سے شائع ہونے والے مختلف جرائد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کا نوجوان طبقہ نئے علوم کی تحصیل اور انھیں اپنے مذہب اور تمدن کے سانچے میں ڈھالنے کا بے حد خواہش مند ہے ۔ افغان لوگ بہت خلیق ہوتے ہیں اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت

سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن کی زیادہ سے زیادہ امداد کریں ۔ اور اب یہ امر بالکل واضح ہے کہ افغان لوگوں میں ایک نئی بیداری پیدا ہو رہی ہے اور ہمیں اُمید واثق ہے کہ ہندوستان کے اندر تعلیمی تجربے کی روشنی میں ہم اُنھیں تعلیمی مسائل میں مفید مشورہ دے سکیں گے ۔

''میرا اپنا یہ خیال ہے کہ خالص دنیوی تعلیم سے اچھے نتائج پیدا نہیں ہوئے اور خصوصاً اسلامی ممالک میں ۔ مزید برآں کسی طریقۂ تعلیم کو قطعی اور آخری نہیں کہا جا سکتا ۔ ہر ملک کی ضروریات کو خاص طور پر مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے ۔''[1]

علامہ اور راس مسعود ۲۳ ۔ اکتوبر کو کابل پہنچ گئے تھے ۔ ان کے قیام کا انتظام کابل کے نئے حصۂ شہر ''دارالامان'' کے شاہی مہمان خانے میں کیا گیا تھا ۔[2] ۲۶ اکتوبر کو رات آٹھ بجے سیّد سلیمان ندوی بھی اپنے ساتھیوں سے آ ملے ۔ راس مسعود صاحب کے ساتھ پروفیسر ہادی حسن بطور سیکرٹری آئے تھے ۔ پروفیسر ہادی حسن ، نواب محسن الملک مرحوم کے بھتیجے تھے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سائنس کے استاد تھے ۔ علامہ کے سیکرٹری غلام رسول خاں بیرسٹر تھے جو امیر حبیب اللہ کے زمانے میں کابل میں بصیغۂ تعلیمات چند سال رہ چکے تھے ۔

۱۔ حرفِ اقبال ، ص ۲۳۰ ۔   ۲۔ اقبالِ کامل ، ص ۳۳ ۔

نادر شاہ سے ملاقات :

سیّد سلیمان ندوی کے حلقۂ یاراں میں شامل ہونے سے پہلے تعلیمی مشورت کے لیے چند اجلاس ہوئے جن میں حکومتِ افغانستان کے بعض سرکردہ افراد نے شرکت کی اور ان اجلاسوں میں کارروائی راس مسعود صاحب نے نوٹ کی ۔ نیز علامہ اور راس مسعود کی ملاقات نادر شاہ سے بھی ہوئی ۔ اس ملاقات کے بارے میں ڈاکٹر ظہیر الدین لکھتے ہیں :

''پہلی ملاقات میں مغرب[1] کی نماز کے موقع پر نادر شاہ نے اقبال سے امامت کی درخواست کی ۔ اقبال نے کہا : نادر ! میں نے اپنی عمر کسی شاہِ عادل کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی تمنّا میں گزار دی ہے ۔ آج جب کہ خدا نے فقیر کی اس مراد کے پورا کرنے کے اسباب مہیا کر دیے ہیں تو کیا تُو مجھے اس نعمت سے محروم کرنا چاہتا ہے ؟ آج میں تیری اقتدا میں نماز پڑھوں گا ۔ امامت تجھ کو کرنی ہوگی ۔''[2]

علامہ نے مثنوی ''مسافر'' میں اس ملاقات کا ذکر نہایت پُراثر طریقے سے کیا ہے :

قصرِ سلطانی کہ نامش دلکشاست
زائراں را گردِ راہش کیمیاست

۱۔ ''عصر'' درست ہے — اختر۔
۲۔ اقبال کی کہانی ، ص ۹۶ - ۹۷ -

شاہ را دیدم درآں کاخِ بلند
پیشِ سلطانے فقیرے دردمند
خُلقِ او اقلیمِ دلہا را کشود
رسم و آئینِ ملوک آنجا نہ بود
من حضورِ آں شہِ والا گُہر
بے نوا مردے بدربارِ عمرؓ
جانم از سوزِ کلامش در گداز
دستِ او بوسیدم از راہِ نیاز
پادشاہے خوش کلام و سادہ پوش
سخت کوش و نرم خوے و گرم جوش
صدق و اخلاص از نگاہش آشکار
دین و دولت از وجودش استوار
خاکی و از نوریاں پاکیزہ تر
از مقامِ فقر و شاہی با خبر
در نگاہش روزگارِ شرق و غرب
حکمتِ او رازدارِ شرق و غرب
شہریارے چوں حکیماں نکتہ داں
رازدانِ مدّ و جزرِ آسماں
پردہ ہا از طلعتِ معنی کشود
نکتہ ہائے ملک و دیں را وا نمود
گفت ازاں آتش کہ داری در بدن
من ترا دانم عزیزِ خویشتن

هر کہ اُو را از محبت رنگ و بوست
در نگاہم ہاشم و محمود اوست
در حضورِ آں مسلمانِ کریم
ہدیہ آوردم ز قرآنِ عظیم
گفتم ایں سرمایۂ اہلِ حق است
در ضمیرِ اُو حیاتِ مطلق است
اندرو ہر ابتدا را انتہا است
حیدر از نیروے او خیبر کشا است
نشۂ حرفم بخونِ اُو دوید
دانہ دانہ اشک از چشمش چکید
گفت "نادر در جہاں بے چارہ بود
از غمِ دین و وطن آوارہ بود
کوہ و دشت از اضطرابم بے خبر
از غمانِ بے حسابم بے خبر
نالہ با بانگِ ہزار آمیختم
اشک با جوئے بہار آمیختم
غیرِ قرآں غمگسارِ من نہ بود
قوتش ہر باب را بر من کشود"
گفتگوئے خسروِ والا نژاد
باز با من جذبۂ سرشار داد
وقتِ عصر آمد صدائے الصلٰوت
آں کہ مومن را کند پاک از جہات

انتہائے عاشقاں سوز و گداز
کردم اندر اقتدائے او نماز
راز ہائے آں قیام و آں سجود
جز ببزمِ محرماں نتواں کشود[1]

عشائیے میں شرکت :

۲۶۔ اکتوبر کو سردار ہاشم خان صدرِ اعظم نے مہمانوں کے اعزاز میں عشائیے کا اہتمام کیا ۔ عشائیے میں افغانستان کے سربرآوردہ افراد ، وزرا اور فوجی افسران شریک تھے ۔ سردار ہاشم خان سے مہمانوں کا تعارف سردار فیض محمد خاں (وزیرِ خارجہ) نے کرایا ۔ اس کے بعد سردار ہاشم خان مہمانوں کو لے کر کھانے کے کمرے میں گئے ۔ کھانا میزوں پر تھا اور ہر چیز یورپی طریقے کے مطابق آراستہ تھی ۔ کھانا کھانے اور کھلانے کا طریق اور ملازموں کا ادب و سلیقہ ہر چیز یورپ کے تمدنِ جدید کے مطابق تھی ۔ علامہ اقبالؒ کے بقول "ہم کو تعجب ہو رہا تھا کہ آیا ہم افغانستان کے شہر کابل میں ہیں یا تمدنِ جدید کی نئی دلّی میں ۔"[2]

کھانے کی میز پر تبادلۂ خیال شروع ہوا ۔ سید سلیمان ندوی نے افغانستان میں اشاعتِ اسلام کے بارے میں گفتگو کی ۔ راس مسعود نے اپنے سفرِ جاپان سے پُرلطف تاثرات اور واقعات بیان کیے اور علامہ

۱۔ مثنوی "مسافر" ، ص ۱۳ - ۱۵ ۔
۲۔ سیرِ افغانستان ، ص ۳۲ ۔

نے فلسفہ و سیاست کے بعض نکات ، آسان اور دوستانہ انداز میں واضح کیے ۔

کھانے سے فارغ ہو کر ملاقات کے پہلے کمرے میں مہمان جمع ہوئے ۔ چائے سگریٹ سے تواضع کی گئی ۔ سردار ہاشم خاں (میزبان) نے دریافت کیا کہ گانا سننے میں تو کوئی حرج نہیں ؟ سید صاحب نے کہا : ''بلا ساز کوئی مضائقہ نہیں ۔'' وہ شاید 'ساز' کا لفظ نہ سمجھے ، کہنے لگے : ''ہمارے ہاں رنڈی منڈی نہیں ہوتی ، مرد گاتے ہیں ۔'' علامہ نے تائید کی ۔ گویے آئے ۔ بیدل اور حافظ کی غزلوں سے فردوس گوش کا سماں پیدا کیا ۔

نمازِ جمعہ :

۲۷۔ اکتوبر جمعہ کا دن تھا ۔ بادشاہ شہر کی مختلف مسجدوں میں باری باری جمعہ کی نماز ادا کرتے تھے ۔ اس روز شہر کی سب سے بڑی مسجد ''پلِ خشتی'' میں نماز پڑھنے والے تھے ۔ علامہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز ادا کرنے مسجد 'پلِ خشتی گئے ۔ مسجد میں بادشاہ کے لیے مقصورہ بنا ہوا تھا ۔ مہمانوں کو بھی مقصورہ میں جگہ دی گئی ۔ نماز جمعہ سے واپسی پر علامہ اور سید صاحب کے ساتھ ایک ذمہ دار شخص بھی تھے ۔ ان سے چینی ترکستان کے واقعات کی نسبت گفتگو ہوتی رہی ۔ علامہ نے دورانِ گفتگو فرمایا :

''یورپ نے اپنی اس نئی ترقی میں اپنا سارا زور بحری طاقت پر صرف کیا اور ہر قسم کی تجارتی آمد و رفت اور سیر و سیاحت کے راستے دریائی رکھے اور اپنے انھی جہازوں کے

ذریعے سے مشرق کو مغرب سے ملا دیا ۔ لیکن اب یہ نظر آ رہا ہے کہ ان بحری راستوں کی یہ حیثیت جلد فنا ہو جائے گی ۔ اب آئندہ مشرقِ وسطیٰ کا راستہ مشرق و مغرب کو ملائے گا اور تری کے بجائے خشکی کا راستہ اہمیت حاصل کرے گا ۔ تجارتی قافلے اب موٹروں ، لاریوں ، ہوائی جہازوں اور ریلوں کے ذریعے مشرق و مغرب میں آئیں جائیں گے ۔ اور چونکہ یہ پورا راستہ اسلامی ملکوں سے ہو کر گزرے گا ، اس لیے اس انقلاب سے ان اسلامی ملکوں میں عظیم الشان اقتصادی و سیاسی انقلاب رونما ہوگا ۔"[1]

واپس مہمان خانے آ کر کھانا تناول کیا اور "نورالمشائخ" سے ملاقات کا پروگرام بنایا ۔

نورالمشائخ سے ملاقات :

افغانستان کی سیاست میں شروع سے علما کو خاصا عمل دخل حاصل رہا ہے اور علما میں مجددی سلسلے کے روحانی پیشوا "ملا" شور بازار نورالمشائخ کا مرتبہ سب سے بلند تھا ۔ "نورالمشائخ" کا اصل نام فضل عمر تھا ۔ آن کے مریدوں کی تعداد لاکھوں میں تھی ۔ ۱۹۱۸ ع کی جنگِ افغانستان میں وہ جنرل نادر خان کے ساتھ شریکِ جہاد تھے اور آن کی تقاریر سے قبائلی مسلمان جوق در جوق لشکر میں شامل ہوئے تھے ۔

۱- سیر افغستان ، ص ۴۰ ۔

برِ صغیر میں بھی اُن کے خاصے مرید تھے - جب امان اللہ خان نے اصلاحات میں حدِ اعتدال سے تجاوز کیا تو آس سے ناراض ہو کر یہاں آ گئے تھے - بچہ سقہ کے پورے دور میں وہ برِ صغیر میں رہے - نادر خان کی کامیابی پر واپس وطن گئے تھے - حکومت نے خیر مقدم کیا اور وزیرِ عدالت مقرر کر دیا - کچھ عرصے تک وزارتِ عدل کا فریضہ انجام دیا مگر اپنی درویشی اور طریقۂ ارشاد کے خلاف سمجھ کر عہدے سے دستکش ہو گئے -

علامہ نے نورالمشائخ سے اُن کی قیام گاہ پر ملاقات کی - وہ علامہ سے لاہور میں مل چکے تھے - سید صاحب نے گفتگو میں خوب حصہ لیا ہے - برِ صغیر کے حالات اور بچہ سقہ کے دور پر بات چیت رہی - چائے نوشی کے بعد علامہ کو نورالمشائخ نے خشک میوے بطورِ تحفہ دیے اور پُر لطف گفتگو کے بعد انھوں نے اجازت لی -

ہندوستانی پارٹی :

افغانستان میں مقیم برِ صغیر کے باشندوں نے اپنے ہم وطن دانشوروں کے اکرام میں کھانے کا انتظام کیا - اللہ نواز خان[1] کے ہاں دعوت کا اہتمام تھا - مدعوین میں سردار فیض محمد (وزیرِ خارجہ) ،

---

۱ - جنگِ عظیم اوّل کے زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور کے گیارہ طالب علم سرحد پار چلے گئے تھے - ان میں سے ایک اللہ نواز خان بھی تھے - اُن کا خاندان ملتان میں آباد تھا - بچہ سقہ سے نجات حاصل کرنے میں اُنھوں نے نادر خان کی مدد کی تھی -

مولانا سیف الرحمان (سابق مدرس ، فتح پور دہلی) ، مولانا محمد میاں المعروف بہ منصور انصاری اور مولانا محمد بشیر (صدر جماعت مجاہدین ، جن کا مرکز چمرقند تھا) نمایاں تھے ۔

دعوت باغ میں تھی ۔ کسی نے باغ کا فوارہ کھول دیا ۔ راس مسعود مبتلائے زکام تھے ۔ اُن کے کہنے پر بند کرنا پڑا ۔ اس موقع پر سردار فیض محمد خان نے مہمانوں کی طرف اشارہ کر کے برجستہ یہ شعر پڑھا :

گوھر شہوار می سازد نثارِ قدمِ تست
"ورنہ از فوارہ مقصودِ دگر کے دارد آب"

مصرع اوّلین تو کسی اَور شاعر کا ہے مگر دوسرے مصرعے نے ، جو خود سردار صاحب کی بدیہہ گوئی کا نتیجہ تھا ، محفل میں ہلکی سی مسکراہٹ پیدا کردی ۔

علامہ نے دوستوں کے اصرار پر پہلا مصرع بدل کر جواب دے دیا ۔ افسوس کہ سیّد سلیمان صاحب کو پورا مصرع یاد نہیں ۔ کچھ یوں تھا :

- - - می شمارد قدرِ احسانِ شما
ورنہ از فوارہ مقصودِ دگر کے دارد آب

چائے سے فارغ ہو کر حاضرین کا گروپ فوٹو لیا گیا ۔ اس کے بعد مولانا محمد بشیر نے مہمانوں کو خیر مقدم کہا جس میں ان دانشوروں کو افغانستان بلانے پر حکومت کا شکریہ ادا کیا ۔ مہمانوں کی طرف سے سیّد سلیمان ندوی مرحوم نے جوابی تقریر کی ۔ علامہ نے بھی مختصر خطاب کیا ۔

سیّد سلیمان ندوی کابل میں چند روز ٹھہر کر پشاور کے راستے ہی واپس آنا چاہتے تھے مگر علامہ سرزمینِ غزنیں کی زیارت کا شوق رکھتے تھے، اس لیے واپسی غزنیں، قندھار اور چمن کے راستے ہوئی۔

صدرِ اعظم سردار محمد ہاشم سے ملاقات:

اگلے روز ۲۸ اکتوبر کو سردار محمد ہاشم مہمانوں سے ملاقات کے لیے اُن کی قیام گاہ پر آئے۔ دیر تک گفتگو رہی۔ راس مسعود صاحب نے ملک میں معدنیات کی ترقی اور سڑکوں کی تعمیر پر زور دیا اور فرمایا کہ معدنیات سے اُن کا مقصود جواہرات اور ہیروں کی کانوں کی دریافت اور ترقی نہیں۔ ان چیزوں کی قدر و قیمت اب پہلے جیسی نہیں رہی — بلکہ اُن کا مقصود مختلف دھاتوں اور خصوصاً پٹرولیم کی دریافت اور جستجو سے ہے جس کی کثیر مقدار ان پہاڑوں اور وادیوں کے اندر معلوم ہوتی ہے۔

سردار محمد ہاشم خان (صدرِ اعظم) نے ترقیاتی پروگراموں پر روشنی ڈالی۔ علامہ نے بھی سڑکوں کی تعمیر پر زور دیا اور آئندہ مستقبل میں مشرقِ وسطیٰ اور افغانستان کی جغرافیائی اہمیت واضح کی۔ صدرِ اعظم نے مہمانوں کے ساتھ کھانا کھایا اور تین بجے رخصت ہوئے۔

شاہ محمود خان وزیر جنگ کی دعوتِ چائے:

چار بجے شام وزیر جنگ شاہ محمود خان کے ہاں چائے کی دعوت تھی جس میں چیدہ افراد نے شرکت کی۔ سات بجے تک اسی دعوت

میں وقت گزرا اور افغانستان کے حالات پر گفتگو ہوتی رہی ۔

انجمنِ ادبی کی دعوت :

ساڑھے سات بجے شب انجمنِ ادبی کابل کی طرف سے دعوتِ شب (ڈنر) طے شدہ تھی ۔ کابل ہوٹل میں انجمن سے منسلک ادیب جمع ہوئے ۔ شہزادہ علی احمد خاں درانی ، جو اسلامیہ کالج لاہور کے تعلیم یافتہ اور سیکرٹریٹ افغانستان کے ایک معزز عہدے دار تھے ، اس انجمن کے سیکرٹری اور روحِ رواں تھے ۔ انجمن ایک ماہانہ مجلہ "کابل" شائع کرتی تھی ۔ اسی مجلے میں علامہ کے دورانِ قیامِ افغانستان میں مندرجہ ذیل نظم (یا غزل) بعنوان "پیامِ اقبال بملتِ کوھسار" شائع ہوئی تھی :

صبا بگوئے بافغانِ کوھسار از نے
بمنزلے رسد آں ملتے کہ خود نگر است

مریدِ پیرِ خراباتیانِ خودبیں شو
نگاہِ او ز عقابِ گرسنہ تیز تر است

ضمیرِ تست کہ نقشِ زمانۂ تو کشد
نہ حرکتِ فلک است ایں ، نہ گردشِ قمر است

دگر بسلسلۂ کوھسارِ خود بنگر !
کہ تو کلیمی و صبحِ تجلی دگر است

بیا بیا کہ بداماںِ نادر آویزیم
کہ مردِ پاک نہاد است و صاحبِ نظر است

یکے است ضربتِ اقبال و ضربتِ فرہاد
جز ایں کہ تیشۂ ما را نشانہ بر جگر است[1]

انجمن کے صدر نشین نے مہمانوں کو خیر مقدم (بزبانِ فارسی) کہا ۔ خیر مقدمی ایڈریس میں مہمانوں کی آمد پر اظہارِ مسرت کیا گیا تھا ۔ علامہ کی علمی خدمات کے تذکرے میں تھا :

"حضرتِ اقبال کے قیمتی آثار و تالیفات ، جن میں سے ہر ایک نے اخلاق ، سعی و عمل ، اجتماع ، جذباتِ شوق ، دوستی اور احساساتِ اسلام پرستی کی اہلِ ایشیا کے جسموں میں روح پھونکی ہے ۔"[2]

خیرمقدم کے بعد افغانستان کے مشہور شاعر جناب قاری عبداللہ خان نے مہمانوں کے اعزاز میں نظم پڑھی ۔ علامہ سے متعلق اشعار ذیل میں درج ہیں :

عزیزان ز ہندوستان آمدند
در افغانیان میہمان آمدند
در آنان یکے دکتر اقبال ہند
سخن پرور و واقفِ حالِ ہند
ادیبِ سخن گسترِ نکتہ سنج
کہ ہر نکتہ اش بہتر آمد ز گنج

۱۔ اسلامی تعلیم ، اقبال نمبر ، ص ۴ ۔ (مارچ تا جون ۱۹۷۴ء) ۔
۲۔ سیرِ افغانستان ، ص ۶۸ - ۶۹ ۔

چمن گردهٔ طرزِ رنگینِ اوست
شکر پارهٔ حرفِ شیرینِ اوست

کلامش چو اوجِ بلندی گرفت
سخن رتبهٔ ارجمندی گرفت

زند طعنہ آہنگ او برق را
کہ خواہانِ بود نہضتِ شرق را

نوین شیوهٔ را بہ سبکِ کہن
درآمیخت از قدرتِ علم و فن

چو اندر سخن جادهٔ نو گزید
پیامش ز مشرق بہ مغرب رسید

سخن را درآمیخت چوں با علوم
ازو زندہ شد طرزِ مولائے روم

چو فکرش پئے فیلسوفی گرفت
طرازِ سخن طرزِ صوفی گرفت

نوایش ہم آہنگ با نفخِ صور
کہ افسردگاں را درآرد بشور

چو بلبل باآہنگ کہسارِ ما
ز ہند آمد این طوطیِ خوشنوا

نظم کے بعد مہانوں کی طرف سے پروفیسر ہادی حسن ، سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی نے تقریریں کیں ۔ سب سے آخر میں ڈاکٹر صاحب نے مندرجہ ذیل تقریر کی جو اس موقع پر بہت پُر اثر

ثابت ہوئی :

"اگرچہ سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کی تقریروں کے بعد اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں ہے جسے میں بیان کروں لیکن انجمنِ ادبی کابل کے ارکان مجھ سے بھی توقع رکھتے ہوں گے کہ خیر مقدم کے جواب میں میں بھی کچھ عرض کروں ۔ میں انجمن کا بہت ممنون ہوں کہ اس نے میرے متعلق نظم و نثر میں بہت اچھے خیالات اور پُر احساس جذبات ظاہر کیے ہیں ۔

"میں بھی خواہش رکھتا ہوں کہ انجمن کے نوجوان ارکان کے عملی پہلو سے بحث کروں ۔ میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا شاعری یا مصوری یا موسیقی یا معماری ان میں سے ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمت گزر ہے ۔ اس بنا پر میں آرٹ کو ایجاد و اختراع سمجھتا ہوں ، نہ کہ محض آلۂ تفریح ۔ شاعر قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد بھی کر سکتا ہے اور برباد بھی ۔ اس وقت جب کہ حکومت یہ کوشش کر رہی ہے کہ موجودہ زمانے میں افغانستان کی تاریخ ایک نئی زندگی کے میدان میں داخل ہو تو اس ملک کے شعرا پر لازم ہے کہ وہ نوجوان قوم کے سچے رہنما بنیں ۔ زندگی کی عظمت اور بزرگی کے بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں ، کیونکہ جب آرٹ موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے ، اس وقت وہ سخت خوف ناک اور برباد کُن ہو جاتا ہے اور جو حسن و

قوت سے خالی ہو وہ محض پیامِ موت ہے :

دلبری بے قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

میں چاہتا ہوں کہ آپ کی توجہ کو ایک مرکزی نقطے کی طرف مبذول کروں ۔ حیاتِ نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے واقعات میں سے ایک واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حضور میں عرب کے مشہور شاعر امراء القیس کے کچھ اشعار پڑھے گئے ۔ ارشاد ہوا : 'اشعر الشعراء و قائدھم الی النار' یعنی تمام شاعروں میں بہترین شاعر اور اُن کو دوزخ کی طرف لے جانے والا ۔

اس ارشادِ سراسر رشاد سے واضح ہے کہ شعر کا کمال بعض اوقات لوگوں پر بُرا اثر مرتّب کرتا ہے ۔ کسی قوم کی زندگی کی موقوف علیہ چیزیں محض شکل و صورت نہیں ہیں ، بلکہ جو چیز حقیقتاً قوم کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے وہ 'تخیّل' ہے جس کو شاعر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے ، اور وہ بلند نظریات ہیں جن کو وہ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے ۔ قومیں شعرا کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں اور اہلِ سیاست کی پامردی سے نشو و نما پا کر مر جاتی ہیں ۔ پس میری خواہش ہے کہ افغانستان کے شعرا اور انشا پرداز اپنے ہم عصروں میں ایسی روح پھونکیں جس سے وہ اپنے آپ کو پہچان سکیں ۔ جو قوم ترقی کے راستے پر چل رہی ہے اُس کی انانیت خاص تربیت کے ساتھ

وابستہ ہوتی ہے ۔ مگر وہ تربیت جس کا خمِ احتیاط کے ساتھ اٹھایا جائے ۔ پس اس انجمن کا کام یہ ہے کہ نوجوانوں کے افکار کو ادبیات کے ذریعے سے متشکل کرے اور ان کو ایسی روحانی صحت بخشے کہ وہ بالآخر اپنی خودی کو پا کر اور قابلیت بہم پہنچا کر پکار اٹھیں :

دو دستہ تیغم و گردوں برهنہ ساخت مرا
فساں کشیدہ بروئے زمانہ آخت مرا
من آں جہانِ خیالم کہ فطرتِ ازلی !
جہانِ بلبل و گل را شکست و ساخت مرا
نفس بہ سینہ گدازم کہ طائرِ حرمم
تواں ز گرمیٔ آوازِ من شناخت مرا

میں ایک نکتہ اور بھی کہنا چاہتا ہوں : مسولینی نے ایک اچھا نظریہ قائم کیا ہے کہ اٹلی کو چاہیے کہ اپنی نجات حاصل کرنے کے لیے ایک کروڑپتی کو پیدا کرے جو اس ملک کے گریبان کو اینگلوسیکسن (Anglo-Saxon) اقوام کے قرضے سے نجات دلا سکے ، یا کسی دوسرے دانتے (Dante) کو پیدا کرے جو نئی جنّت پیش کرے ، یا کسی نئے کولمبس (Colombus) کو پیدا کرے جو ایک نئے براعظم کا پتا لگائے ۔ اگر آپ مجھ سے دریافت کریں تو میں کہوں گا کہ افغانستان کو بھی ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو قبائلی زندگی سے نکال کر وحدتِ ملّی کی زندگی سے آشنا کر سکے ، اور مجھے خوشی ہے

کہ افغانستان کو ایک مردِ کامل مل گیا ہے جس کا وہ عرصے سے انتظار کر رہا تھا ۔ اور مجھے یقین ہے کہ اعلٰی حضرت نادر شاہ کی شخصیت کو اسی لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ افغانستان کو ایشیا میں ایک نئی قوم بنا کر دنیا سے متعارف کرائیں ۔ اس ملک کے نوجوانوں کو چاہیے کہ اس بزرگ راہنما کو اپنی تعلیم و تربیت کا معلّم سمجھیں کیونکہ ان کی زندگی ایثار ، اخلاص اور اپنے ملک کے ساتھ صداقت اور اسلام کے ساتھ عشق و محبت سے لبریز ہے[1] ۔"

ان پُرلطف علمی تقریروں کے بعد کھانا کھایا گیا ۔ کچھ دیر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا ۔ علامہ کا دل پسند حُقہ بھی رفیقِ سفر تھا ۔ علامہ گفتگو کے ساتھ ساتھ حُقہ بھی گڑگڑاتے رہے ۔ رات دس بجے قیام گاہ پر واپس آئے ۔

۲۹- اکتوبر کو سردار احمد خاں وزیرِ دربار کی دعوت پر شام تین بجے یغمان جانے کا پروگرام تھا ۔ چونکہ علامہ کو نادر شاہ سے آخری ملاقات بھی کرنا تھی ، اس لیے یغمان جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا ۔ وہ شام کو وزیرِ خارجہ سردار فیض محمد خان کے ساتھ شاہ سے ملنے اُن کی رہائش گاہ ''دلکشا'' گئے ۔

رات کو مختلف حضرات ملاقات کی غرض سے آئے ۔ مولوی محمد بشیر صاحب صدر جمعیت مجاہدین ، مولانا محمد میاں ، منشی میر شمس الدین (سابق ناظم انجمنِ حمایتِ اسلام ، لاہور) کے صاحبزادے میر

۱- سیرِ افغانستان و مقالات اقبال (مرتّبہ معینی) ۔

رحمت اللہ ہمایوں ان میں ممتاز تھے ۔

۳۰- اکتوبر کو صبح آٹھ بجے غزنیں کے لیے روانہ ہوئے ۔ حکومتِ افغانستان نے مہمانوں کے باسہولت سفر کا پورا اہتمام کیا تھا ۔ متوقع قیام گاہوں میں پہلے سے پیغام بھجوا دیے گئے تھے اور بطورِ میزبان سرور خاں گویا ساتھ تھے ۔ سواری اور باربرداری کے لیے دو موٹریں اور دو لاریاں دی گئی تھیں ۔ ایک موٹر میں علامہ اقبال ، سید سلیمان ندوی اور بیرسٹر غلام رسول تھے اور دوسری موٹر میں پروفیسر ہادی حسن ، سرور خاں گویا اور عبدالمجید (نمائندہ سفارت خانۂ افغانستان ، دہلی) تھے ۔ ایک لاری کھانے کے سامان اور کھانا پکانے اور کھانے والے ملازمین کے لیے تھی ۔ دوسری لاری پر مہمانوں کا سامان لدا تھا ۔ اس قافلے میں اعزاز اور حفاظت کی غرض سے دس بارہ سپاہیوں کا دستہ بھی شامل تھا ۔

غزنیں کابل سے بیاسی میل دور ہے ۔ موٹریں دشت و جبل اور نشیب و فراز طے کرتی ہوئی ایک بجے غزنیں پہنچ گئیں ۔ مہمانوں نے پہلے بازار کی سیر کی اور پھر قیام گاہ پر آ کر کھانا تناول کیا ۔

غزنیں کے آثارِ قدیمہ کی سیر کے لیے افسرِ مہمان داری سرور خاں گویا نے ایک پیرِ فرتوت "ملا" قربان کو بلایا ۔ یہ صاحب نوّے سال کی عمر کے تھے اور غزنیں کے گوشے گوشے سے آگاہ ۔ موجودہ شہر سے کئی میل ہٹ کر قدیم شہر کے نشانات ہیں جو سلاطینِ غزنیں کا پایۂ تخت تھا ۔ اس مقام کے مخالف سمت ، شہر کی دوسری طرف پرانا قبرستان ہے جہاں بیسیوں عہد ساز ہستیاں محوِ خواب ہے ۔

فاتحہ بر مزاراتِ حکیم سنائی و سلطان محمود :

علامہ ، سنائی کے مزار پر حاضر ہونے کا اشتیاق رکھتے تھے ، اس لیے سب سے پہلے مہمان خانے سے پیدل مزار گئے اور مسنون دعا پڑھی - یہاں تمام حاضرین متاثر تھے - "سب سے زیادہ اثر ڈاکٹر اقبال پر تھا - وہ حکیمِ ممدوح کے سرہانے کھڑے ہو کر بے اختیار ہو گئے اور دیر تک زور زور سے روتے رہے[1] -"

دوسرے چشم دید گواہ سرور گویا لکھتے ہیں : "حکیم سنائی کی قبر پر آس (علامہ) نے اتنے آنسوؤں کا پانی چھڑکا کہ وہاں کے پتھر موم ہو گئے[2] -"

یہاں سے فارغ ہو کر سلطان محمود غزنوی کے مزار پر فاتحہ کے لیے قافلہ چلا - بروایتِ گویا "سلطان محمود کے روضے کی ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی علامہ نے اپنا سر فرطِ احترام سے جھکا لیا تھا[3] -"

حضرت علی ہجویری (داتا گنج بخش) کے والد کا مزار :

سلطان محمود غزنوی کے مزار سے واپس آتے ہوئے علامہ کو لاہور کی مناسبت سے حضرت داتا گنج بخش کے والد بزرگوار کے مزار کی تلاش ہوئی - چنانچہ آن کی ہدایت کے مطابق مُلا قربان نے قدیم ویرانوں میں قبر تلاش کی اور جملہ حضرات نے دعائے مسنونہ

۱- سیر افغانستان ، ص ۱۲۹ -
۲- مقالاتِ یومِ اقبال (۱۹۶۷ء) ، ص ۳۶ -
۳- مقالاتِ یومِ اقبال ، ص ۳۶ -

پڑھ کر گھر کا راستہ لیا۔ سرور گویا اُس روز کے تاثرات کو ان الفاظ میں سمیٹتے ہیں :

"جب ہم ان مقدس اور پُرجلال مقامات پر پہنچے ہیں تو ہم تو دعا میں مشغول تھے لیکن شاعرِ اسلام کو ہم نے وہاں دیکھا کہ وہ ایک بے جان تصویر کی طرح کھڑا ہے اور آنسوؤں کا دریا اُس کی آنکھوں سے اُمڈ رہا ہے۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر ہم میں بھی یارائے ضبط نہ رہا[1]۔"

۳۱۔ اکتوبر کو آٹھ بجے صبح غزنیں سے آگے روانہ ہوئے اور گیارہ بجے دوپہر مُقر پہنچے۔ راستہ بہت صاف اور ہموار تھا۔ مُقر میں سرکاری افسروں کو مہمانوں کے آنے کی اطلاع تھی۔ جیسے ہی موٹریں آ کر رکیں، گارڈ آف آنر نے سلامی دی۔ ایک دو منزلہ عمارت میں قیام و طعام کا انتظام تھا۔ دوپہر کا کھانا یہاں کھانے کے بعد ایک بجے قلات کا رخ کیا۔ تین گھنٹے میں قلات غلزئی پہنچ گئے۔ مہمان خانہ کھلے میدان میں واقع تھا اور آس پاس کوئی آبادی نہ تھی۔ قلات غزنیں سے ایک ہزار فٹ اور کابل سے دو ہزار فٹ بلند ہے، اس لیے قدرتی طور پر ٹھنڈک زیادہ تھی۔ رات قلات کے مہمان خانے میں کٹی۔

یکم نومبر کو صبح سویرے تمام افراد اٹھے۔ ناشتہ کرنے کے بعد آٹھ بجے سفر شروع کیا گیا۔ چار گھنٹے میں قندھار پہنچ گئے۔ شاہی قیام گاہ میں ٹھہرنے کا پروگرام تھا۔

۱۔ مقالاتِ یومِ اقبال، ص ۳۷۔

عبدالحی خان سے ملاقات :

مہمانوں کی آمد پر شہر کے ممتاز افراد ملاقات کے لیے آئے جن میں وزارتِ خارجہ افغانستان کا نمائندہ متعینۂ قندھار اور یہاں کی ادبی انجمن کے ناظم عبدالحیٔ خان بھی شامل تھے - عبدالحئی خان ایک پشتو رسالہ " طلوع افغان" کے مدیر بھی تھے - وہ کچھ عرصہ کراچی میں مقیم رہے تھے ، اس لیے آردو اچھی بول لیتے تھے - ان کی ادبی انجمن اور رسالہ "طلوعِ افغان" پشتو زبان کو سرکاری اور تعلیمی زبان بنانے کی تحریک کے علمبردار تھے[1] - انھوں نے آتے ہی علامہ اقبال سے اس موضوع پر گفتگو شروع کر دی - علامہ نے جواب میں زبانوں کی نشو و نما اور ترقی پر اصولی بحث فرمائی اور اس بات پر زور دیا کہ زبان ایک قوم کے مختلف افراد کی باہم پیوستگی کا سب سے ضروری اور مؤثر ذریعہ ہے - لیکن اگر اس تحریک سے قوم کے افراد میں اتحاد کے بجائے اختلاف رونما ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ پیوستگی کا پیغام ہونے کی جگہ نزاعات اور اختلافات کا ترانۂ جنگ ہے جس سے افغان قوم کو موجودہ منزل میں بہت کچھ بچنا چاہیے[2] -

---

۱- آج کل افغانستان میں پشتو اور فارسی دونوں زبانیں ذریعۂ تعلیم ہیں - پچھتر فی صد آبادی یہی دو زبانیں بولتی ہے - پشتو پٹھانوں کی مادری زبان ہے اور افغانستان کے مشرق و جنوب مشرق علاقوں میں جلال آباد سے قندھار تک بولی جاتی ہے - ۱۹۳۶ء میں ایک شاہی فرمان کے ذریعے اسے قومی زبان کا درجہ دیا گیا - پشتو اکیڈمی (پشتو ٹولنہ) کے ذریعے پشتو زبان کی خوب ترویج و ترقی ہوئی -

۲- سیر افغانستان ، ص ۱۴۹ -

ابھی علامہ ، عبدالحیٰ خاں سے باتیں کر رہے تھے کہ قندھار کے گورنر تشریف لائے ۔ اُن سے بھی کچھ دیر باہم دلچسپی کی گفتگو رہی ۔

زیارتِ خرقہ شریف :

مہمان خانے کے قریب ہی خرقہ شریف کی زیارت اور احمد شاہ درانی کا مقبرہ تھا ۔ ان مقامات کی زیارت کے لیے علامہ اور دوسرے افراد پیدل روانہ ہوئے ۔ البتہ واپسی کے لیے موٹروں کو مقبرے کے دروازے پر پہنچ جانے کا حکم دیا گیا ۔ پہلے خرقہ شریف کی زیارت کی ۔ مشہور ہے کہ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا ملبوسِ اقدس ہے ۔ مثنوی "مسافر" میں علامہ لکھتے ہیں :

خرقۂ آں "برزخ لایبغیان"[1]
دیدمش در نکتۂ "لی خرقتان"[2]

مقبرۂ احمد شاہ ابدالی :

خرقہ شریف کی زیارت کے بعد تیسری جنگِ پانی پت کے ہیرو احمد شاہ ابدالی کے مقبرے پر مسنون دعا پڑھ کر سڑک پر آئے تو موٹریں موجود تھیں ۔ یہاں سے قندھار کے سب سے خوب صورت اور دل کش طبعی منظر ارغنداب کی سیر کو روانہ ہوئے ۔

۱۔ تلمیح بآیتِ قرآن (سورۃ الرحمٰن) ۔
۲۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حدیث ہے : "لی خرقتان الفقر و الجہاد" (میرے دو خرقے ہیں ، ایک فقر اور دوسرا جہاد) ۔

ارغنداب :

ارغنداب کی سیر کرتے ہوئے بابا ولی قندھاری کے مزار پر فاتحہ پڑھی ۔ واپسی پر ”چھل زینہ“ گئے ۔ یہ ایک پہاڑی ہے جس کی چوٹی پر بابر نے اپنی بندی فتوحات کا کتبہ لگایا ہے ۔ پہاڑی کے دامن سے اوپر تک پتھر کاٹ کر زینے بنائے گئے ہیں جن کی تعداد چالیس مشہور ہے ، اس لیے اس پہاڑی کا نام ”چھل زینہ“ پڑ گیا ہے ۔ علامہ پہاڑی پر نہ چڑھے البتہ سیّد صاحب اور پروفیسر ہادی نے اپنے تاریخی ذوق کی تسکین کے لیے پہاڑی سر کی ۔

خان بہادر سیّد صدیق حسن سے ملاقات :

راس مسعود کو وطن واپسی کی سخت جلدی تھی ۔ وہ رات کو رخصت ہو کر چمن پہنچنا چاہتے تھے تاکہ وہاں سے جلدی علی گڑھ پہنچ جائیں ۔ قندھار میں حکومتِ برطانیۂ ہند کی طرف سے قونصل خانہ تھا اور قونصل ، علامہ کے دوست سید غلام بھیک نیرنگ کے حقیقی بھائی خان بہادر سید صدیق حسن تھے ۔ علامہ سے اُن کی پرانی ملاقات تھی ۔ خان بہادر صاحب نے راس مسعود صاحب کی ہر ممکن مدد کی اور اس طرح قافلے کی یہ ”متاعِ گراں بہا“ رات کو سفر پر روانہ ہوگئی ۔ باقی رفقا نے رات قندھار میں بسر کی ۔

۲ نومبر کو آٹھ بجے صبح چائے اور ناشتے سے فارغ ہوئے ۔ گورنر قندھار نے مہمانوں کو کچھ خشک میوے اور قندھاری اناروں کے دو ٹوکرے تحفتاً بھیجے اور قافلہ چل پڑا اور بارہ بجے قلعۂ جدید

پہنچ گیا ۔ یہ افغانستان کی آخری چوکی ہے ۔ یہاں گویا اور دوسرے شاہی ملازمین نے علامہ اور اُن کے ساتھیوں کو الوداع کہی ۔

چمن :

چمن شہر کے دروازے پر مسلمانانِ شہر نے استقبال کیا اور ایک ریستوران میں چائے کا اہتمام کیا ۔ اہالیانِ شہر کی خواہش تھی کہ علامہ اور سیّد صاحب اپنا سفر ملتوی کر کے یہاں کے مسلمانوں کے سامنے تقاریر کریں مگر ہر دو حضرات نے معذرت کردی ۔

ریستوران میں مختلف خیال کے مسلمان جمع ہو گئے تھے ، جو سیاسیات کی مختلف راہوں سے آشنا تھے ۔ وہ علامہ اور سید صاحب سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے ۔ یہیں علامہ کے سکول کے زمانے کے ایک ہندو دوست ، جو چمن میں مطب کرتے تھے ، سامنے آئے ۔

اگرچہ چمن سے ریل شروع ہو جاتی ہے مگر علامہ صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے ایک دن بچانے کی خاطر موٹروں سے سفر کیا ۔ چمن سے ریل صرف ایک وقت چلتی تھی ۔ اگر ریل کا سفر اختیار کیا جاتا تو رات چمن میں ٹھہرنا ضروری تھا ۔ تقریباً چار بجے شام چمن سے روانہ ہوئے اور کوئٹہ تک چار گھنٹے کا سفر سید صاحب سے تبادلۂ خیالات میں گزارا ۔ سید صاحب لکھتے ہیں :

”عجیب اتفاق کہ راستہ تو خطرناک درپیش تھا اور ڈاکٹر اقبال صاحب نے روحانیات کے ذاتی مشاہدات و تجارب اور ایک سچے پیر کی تلاش پر گفتگو شروع کر دی ۔ یہ گفتگو طرفین سے نہایت دلچسپ ہو رہی تھی ۔ اس عہد

کے مختلف شیوخ اور بزرگانِ سلاسل کا تذکرہ رہا ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے آغازِ زندگی اور طالب علمانہ عہد کا ذکر چھیڑا ۔ پھر اپنے والدِ مرحوم کا تذکرہ کیا ۔ وہ خود ایک صاحبِ دل صوفی تھے اور اکثر دین دار علما کی صحبت میں رہتے تھے ۔ اس ضمن میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے جلیل القدر اسلامی شاعر کے حسیاتِ خفتہ کے تاروں میں جس مضراب نے حرکت پیدا کی وہ خود آن کے والدِ ماجد کی ذاتِ بابرکات تھی[۱] ۔''

چنانچہ علامہ اپنے والدِ مرحوم کی زندگی کے یادگار واقعات سناتے رہے ۔

۳ نومبر کو کوئٹہ میں رات ڈاک بنگلے میں گزاری ۔ دس بجے صبح سٹیشن پر آئے ۔ گیارہ بجے گاڑی چلی اور ملتان تک سید صاحب اور علامہ کا ساتھ رہا ۔ علامہ ملتان سے لاہور کی گاڑی میں بیٹھے اور اسی روز شام کو اپنے گھر پہنچ گئے ۔

اخباری بیان :

۶ نومبر ۱۹۳۳ء کو علامہ نے اپنے ہم سفروں کے ایما پر اپنے دورے کے بارے میں حسب ذیل اخباری بیان جاری کیا :

''سب سے پہلے جو قابلِ ذکر چیز ہمیں نظر آئی یہ ہے کہ افغانستان میں لوگوں کے جان و مال بالکل محفوظ ہیں ۔

۱- سیر افغانستان ، ص ۱۲۸ - ۱۲۹ -

یہ ایک ایسی حکومت کے لیے بذاتِ خود ایک بہت بڑی کامیابی ہے جسے صرف چار سال پیشتر ملک میں عام بغاوت کو فرو کرنا پڑا ہو۔ دوسری بات جس سے ہم متاثر ہوئے وہ وہاں کے وزرا کی نیک نیتی اور اخلاص ہے جس سے وہ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ سخت قسم کے قدامت پسند لوگ بھی ان وزرا کے حامی ہیں اور نتیجۃً ہمارے سامنے ایک مقتدر افغان عالم نے کہا کہ آج کے افغانستان میں مُلاؤں اور نوجوانوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔
"حکومتِ افغانستان کا ارادہ ہے کہ سارے محکمۂ تعلیم کو جدید طریقوں پر از سرِ نو ترتیب دیا جائے اور ساتھ ساتھ افغانستان اور ہمسایہ ممالک کے درمیان پڑنے والی سڑکوں کی مرمت کی جائے۔ نئی یونیورسٹی بتدریج ترقی کر رہی ہے اور اس کے لیے پہلے ہی ایک خوب صورت اور وسیع محل مخصوص کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے شعبۂ طب قائم کیا گیا ہے اور اس میں اعلیٰ تعلیم شروع ہو گئی ہے۔ دوسرا شعبہ، جس کا قیام زیرِ غور ہے، وہ سول انجینیرنگ کا ہوگا۔ رہا سڑکوں کا سوال، تو کابل کو پشاور سے ملانے والی ایک نئی سڑک آیندہ دو سال کے عرصے میں مکمل ہو جائے گی۔ اس سڑک کا نقشہ بڑے غور و فکر سے تیار کیا گیا ہے۔ روسی سرحد تک جانے والی سڑک مکمل ہو چکی ہے اور یہ سڑک اس لیے بہت اہم ہے کہ یہ وسطی ایشیا کو وسطی یورپ سے قریب کر

دیتی ہے۔

اعلیٰ حضرت شاہِ افغانستان نے ہمیں شرفِ باریابی بخشا اور کافی طویل گفتگو ہوتی رہی۔ اعلیٰ حضرت کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اُن کا ملک پھلے پھولے اور اپنے ہمسایہ ممالک سے صلح اور آشتی قائم رکھے۔

"افغانستان آج ایک متحد ملک ہے جہاں ہر طرف بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں اور حکام کافی غور اور سوچ بچار کے بعد نئے پروگرام بنا رہے ہیں۔ افغانستان سے ہم اس یقین کے ساتھ واپس ہوئے ہیں کہ اگر موجودہ حکام کو دس سال تک اپنا کام جاری رکھنے کا موقع مل جائے تو بلا شک و شبہ افغانستان کا مستقبل روشن ہے[1]۔"

علامہ نے اس سفر کی یاد میں ایک مثنوی "مسافر" لکھی اور افغانستان کے مناظرِ فطرت سے دل کھول کر لطف اُٹھایا۔ جمال الدین احمد، محمد عبدالعزیز کی تالیف "افغانستان" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"جب افغانستان کے بارے میں سوچتا ہوں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے، تو میرے سامنے افغانوں کے دیس کی وہ تصویر گھومنے لگتی ہے جیسی میں نے پچھلے موسمِ خزاں میں دیکھی تھی۔ میں ایک سادہ سے آرام دہ کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں۔ آس پاس باغ ہے۔ باغ سے پرے زمین کا ایک بڑا ٹکڑا آہستہ آہستہ اُوپر کو اُبھرتا چلا جاتا ہے

۱۔ حرفِ اقبال، صفحات ۲۳۱ - ۲۳۲۔

یہاں تک کہ پہاڑی سلسلے میں جا ملتا ہے ۔ اس کے پیچھے بلند ہوتی ہوئی پہاڑیوں کی ایک قطار ہے یہاں تک کہ یہ بلندیاں ہندو کش کے سلسلے تک جا پہنچتی ہیں ۔ دور تک پھیلے ہوئے میدانوں کے اس پار اونچی اونچی روشیں ہیں ۔ دور دراز سے آتی ہوئی طوفانی ہوائیں جنھیں چیرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں ۔ اوپر مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج کے پاس حسین اور خوشنما رنگوں سے آراستہ آسمان نظر آتا ہے ۔ نیچے وادیوں میں سائے تیزی سے رینگتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ لاتعداد پتلے لمبے سرو کے درخت ان سایوں کے درمیان اپنے پر پھیلائے کھڑے ہیں ۔ سبک سیر ہوائیں ان کی پتیوں کو چومتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں ۔ شفق کے سکون میں وادی ، وادی کے درخت ، دور افتادہ گاؤں اور دھندلے کُہر کے سمندر میں بہتے ہوئے پہاڑ خوابوں جیسا حسین منظر پیش کرتے ہیں ۔ پھر ایکا ایکی شام کا جادو اذان کی آواز سے ٹوٹ جاتا ہے ۔ میرے سب ساتھی اپنی اپنی جگہیں چھوڑ دیتے ہیں ۔ مؤذن کی دل میں اتر جانے والی آواز مجھے کہیں اپنے سے بھی دور لے جاتی ہے اور میں مسجد میں سب کے بعد پہنچتا ہوں جہاں میرے ساتھی مہمان اور مصاحبوں کے ساتھ شاہی میزبان جمع ہیں[1] ۔"

۱۔ ماہ نو (اپریل ۱۹۶۵ء) ، ص ۱۲ ۔

۴

ادارۂ معارفِ اسلامیہ ، لاہور

۱۹۲۸ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا ۔ کانفرنس کے شعبۂ عربی و فارسی کی صدارت علامہ اقبال نے کی ۔ اس کانفرنس کے اجلاس سے اُن کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ علومِ اسلامیہ کی تحقیق و ترویج کے لیے بھی ایک ادارہ قائم ہونا چاہیے ۔ چنانچہ اُن کی تحریک اور رہنمائی میں لاہور کے بعض علم دوست مسلمانوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے فیصلہ کیا کہ مجوزہ ادارے کا نام ''ادارۂ معارفِ اسلامیہ'' ہو اور ہر دوسرے سال اس کا اجلاس برصغیر کے کسی بڑے شہر میں ہوا کرے جہاں اہلِ علم جمع ہو کر اپنے علمی مقالات سے حاضرین کو مستفید کریں ۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ ان اجلاسوں میں پڑھے جانے والے مقالات کتابی صورت میں شائع ہوں ۔

مندرجہ ذیل اصحابِ علم ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے عہدہ دار چنے گئے تھے :

شیخ سر عبدالقادر (صدر) ۔

شیخ محمد اقبال اوریئنٹل کالج لاہور (سیکرٹری) ۔
خواجہ عبدالوحید (جائنٹ سیکرٹری) ۔

اس ادارے میں برصغیر کے اہلِ دانش نے خوب دلچسپی لی اور خاص طور پر علامہ اقبال کے احباب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ سید سلیمان ندوی ، ''معارف'' کے شذرات میں قارئینِ 'معارف' کو ادارے کی سرگرمیوں سے مطلع کرتے رہے ۔ اکتوبر ۱۹۳۲ع کی اشاعت میں ادارے کے قیام اور اس کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے ۔ لکھتے ہیں :

''پنجاب کے اہلِ علم اصحاب نے ادارۂ معارف اسلامیہ کے نام سے ایک خاص علمی مجلس کی بنیاد ڈالی ہے جس کے مقاصد یہ ہیں :

۱۔ ہندوستان کے تمام محققینِ علومِ اسلامیہ کے درمیان اشتراکِ عمل ، اتحادِ ذہنی و اجتماعی اور وسائلِ امدادِ باہمی کے قیام میں سہولتیں بہم پہنچانا ۔

۲۔ محققین کی ایسی مشکلات کو ، جو بسا اوقات ان کے مشاغلِ علمیہ میں پیش آتی ہیں ، حتی الامکان رفع کرنے کی کوشش کرنا ۔

۳۔ محققین کو نتائجِ تحقیقاتِ علمیہ کی اشاعت کی غرض سے جمع کرنا ۔

۴۔ بیرونی ممالک کے مستشرقین کو وقتاً فوقتاً افادۂ علمیہ کی غرض سے دعوت دینا ۔

۵۔ ارتقائے تمدنِ اسلامی کے سلسلے میں اسلام کی مختلف خدمات کو منظرِ عام پر لانا ۔

۶- عام طور پر اسلامی تحقیقات کے لیے قوم میں تحریص و تشویق کی تحریک جاری رکھنا ۔

۷- آمدنی کافی ہونے پر ایک دارالکتب ، ایک دارالاشاعت اور مشرقیات کا ایک دارالنفائس (میوزیم) کھولنا ۔

اس ادارے کی وسعتِ کار حسبِ ذیل دائروں پر مشتمل ہوگی : ادبیات و لسانیات ، اخبار و آثار ، جغرافیہ و سیاحت ، مذہبیات ، فلسفہ ، عمرانیات ، فنونِ لطیفہ ، علومِ حکمیہ ، صنعت و حرفت اور قومیات ۔ ان تمام علوم و فنون کے الگ الگ دائرے ہوں گے اور اُن کے متعلق تحقیق و تلاش کا کام ہوگا اور مجوزہ کتب خانے میں اس کے متعلق کتابیں اور سامانِ تحقیق مہیا ہوں گے ۔

اس وقت تک اس میں لاہور کے اورینٹل کالج ، ٹریننگ کالج اور اسلامیہ کالج کے مسلمان پروفیسروں نے شرکت کی ہے اور سر اقبال اور سر عبدالقادر نے ان کی رہنمائی اور سربراہی قبول کی ہے ۔ رکنیت کے لیے پانچ روپے سالانہ اور اس کے کسی عام علمی جلسے میں شرکت کی فیس دو روپے ہوگی ۔ مجلس نے امرائے اسلام کے دستِ کرم کو اپنی امداد کے لیے جنبش دی ہے اور سب سے پہلے اس کی اعانت کے لیے وہ ہاتھ اُٹھا ہے جو ہمیشہ اس قسم کے کاموں کے لیے اُٹھا کرتا ہے ؛ یعنی اعلیٰ حضرت سرکار نظام

خلداللہ ملکہ نے اس کے لیے دو ہزار روپے سالانہ کی اعانت منظور فرمائی ہے۔

مجلس کا ارادہ ہے کہ آیندہ سال فروری ۱۹۳۳ء میں لاہور میں اپنا اجلاس منعقد کرے اور تمام اہلِ علم اور ماہرینِ علومِ اسلامیہ سے درخواست کی ہے کہ وہ اس میں شرکت کریں اور کسی مسئلے پر اردو میں، عربی و فارسی میں یا انگریزی میں کوئی تحقیقی مقالہ پیش کریں۔

خط و کتابت کا پتہ: پروفیسر شیخ محمد اقبال، اورینٹل کالج، لاہور۔"

فروری ۱۹۳۳ء کے بجائے اپریل ۱۹۳۳ء میں ادارے کا پہلا اجلاس طے پایا۔ اپریل کے شمارۂ 'معارف' میں اطلاع دی گئی ہے:

"۱۵ - ۱۶ اپریل ۱۹۳۳ء کو لاہور میں ادارۂ معارفِ اسلامیہ کا جلسہ ہے جس میں مختلف اہلِ علم اسلامی علوم و فنون پر مختلف مقالات پڑھیں گے۔ اس سلسلے میں دارالمصنفین کے بعض رفقاء بھی لاہور جائیں گے اور جلسۂ مذکور میں اپنے مقالات پیش کریں گے۔ میرا مضمون "لاہور کا ایک مہندس خاندان — جس نے تاج محل اور لال قلعہ بنایا" ہوگا۔

مولوی سیّد ریاست علی صاحب ندوی، مسلی کے اسلامی تمدن پر اور مولوی سعید انصاری، عربی لغت کی تاریخ پر مضامین پڑھیں گے۔"

تذکرۃ الصدر اطلاع کے مطابق سیّد صاحب اور آنؒ کے

رفقاء اجلاس میں شریک ہوئے۔ چنانچہ مئی ۱۹۳۳ع کے "شذرات" میں لکھا:

"گزشتہ اطلاع کے مطابق ۱۵- اپریل کو راقم اور اس کے دو رفقائے دارالمصنفین مولوی سعید صاحب انصاری اور مولوی ریاست علی صاحب ندوی نے لاہور میں ادارۂ معارفِ اسلامیہ کے اجلاس میں شرکت کی۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سبب سے یو۔پی کے بعض اہلِ علم بھی شریکِ اجلاس تھے۔ پہلا جلسہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی صدارت میں شروع ہوا۔ لاہور کے تمام سربرآوردہ اہلِ علم اور پنجاب اور دہلی کے کالجوں کے مشرقی علوم کے بعض استاد اور پروفیسر بھی شریک تھے۔ پہلے اجلاس میں صدارتی خطبوں کے بعد سب سے پہلا مقالہ راقم الحروف کا پیش ہوا جس کا عنوان تھا "لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج محل اور لال قلعہ بنایا"۔ اس مقالے میں اس خاندان کے تقریباً ڈیڑھ سو برس کے علمی کارناموں کی سرگزشت نا معلوم گوشوں سے تلاش اور تفحّص کے ساتھ مرتّب کی گئی تھی اور تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ اس خاندان کے مورثِ اول نادرالعصر استاد احمد معمارِ شاہجہانی لاہوری کے حالات بتائے گئے تھے اور اس کے بیٹے "ملا" لطف اللہ مہندس کی (جو شاہجہان کے زمانے میں موجود تھا اور دارا شکوہ کا درباری تھا) معاصرانہ شہادت سے حقیقت ثابت کی گئی اور ثابت کیا گیا کہ تاج کا معمار

درحقیقت یہی استاد احمد معمار شاہجہانی لاہوری ہے۔ یہ ہندسہ، ہیئت اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس دریافت سے وہ تمام افواہیں، جو تاج کے کاریگروں اور معماروں کی نسبت مشہور تھیں، بے سروپا ثابت ہو کر رہ گئیں۔"

ادارے کا دوسرا اجلاس اپریل ۱۹۳۶ء میں لاہور میں ہوا۔ اس کے بارے میں "معارف" اپریل ۱۹۳۶ء میں اطلاع دی گئی ہے:

"لاہور کے ادارۂ معارف اسلامیہ کے جلسے شاید ان اوراق کے آپ کے ہاتھوں میں پہنچنے تک ہو چکیں۔ آج سے ڈھائی سال[1] پہلے ادارے کا پہلا اجلاس ہوا تھا جس میں اسلامی علوم و فنون اور تمدن کے متعلق بہت سے محققانہ مضامین پڑھے گئے تھے اور جن کا مجموعہ مجلس کے پہلے سال کی روداد میں شائع ہو چکا ہے۔ توقع ہے کہ اس کا دوسرا اجلاس، جو ۱۰ اپریل سے ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء تک ہوگا، پہلے سے بڑھ چڑھ کر ہوگا۔ عربی اور فارسی کی قلمی کتابوں اور سکّوں کی نمائش بھی ساتھ ساتھ ہوگی۔"

ادارے کا تیسرا اجلاس ۲۶ سے ۲۸ دسمبر ۱۹۳۸ء کو دہلی میں ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس مرتبہ بھی حسبِ سابق مخطوطات اور مسکوکات کی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دارالمصنفین سے شاہ محمد معین الدین ندوی نے شرکت کی تھی۔

ادارے کے چوتھے اجلاس کے بارے میں ستمبر ۱۹۴۱ء کے

۱۔ تین سال درست ہے۔ پہلا اجلاس ۱۵، ۱۶ اپریل ۱۹۳۳ء کو ہوا تھا۔

"معارف" میں اطلاع ملتی ہے :

"ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کا پچھلا اجلاس دہلی میں ہوا تھا ، جس کی روداد یا چھپ گئی ہے یا چھپ رہی ہے ، اور اس کے آئندہ اجلاس کی تجویز دارالمصنفین اور طلبائے قدیم ندوۃ العلماء کی دعوت پر لکھنؤ میں ہوئی تھی ، لیکن جنگ کے ناگزیر اسباب کی بنا پر اب تک یہ اجلاس منعقد نہ ہو سکا - خیال ہے کہ جنگ کے خاتمے کے انتظار میں جلسے کو ملتوی نہ کیا جائے اور ۱۹۴۲ء کے آغاز میں اپریل تک اس کے انعقاد کی کوشش کی جائے - آمید ہے کہ دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء کے علاوہ مسلم یونیورسٹی اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بھی اس میں امداد حاصل کی جائے (گی) - مصارف کا تخمینہ ہزار بارہ سو ہے -"

مارچ ۱۹۴۲ء کے "معارف" میں اجلاس کے التوا کی خبر ان الفاظ میں درج ہے :

"ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کا جو اجلاس دارالمصنفین اور طلبائے قدیم ندوۃ العلماء کی دعوت پر ۱۷ ، ۱۸ ، ۱۹ مارچ کو لکھنؤ میں ہو رہا تھا ، وہ بعض وجوہ سے ملتوی کر دیا گیا ہے -"

یہ چوتھا اجلاس نہ ہو سکا اور ادارہ چند سال بہار دکھا کر مرجھا گیا - اس کے تین اجلاسوں کی رودادیں شائع ہو چکی ہیں - ادارے کی مساعی سے علمی و تحقیقی ذوق نے نمو پائی - اس کے اجلاسوں میں پڑھے گئے مقالات نے علمی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے - آج بھی ان کا ذکر بطورِ حوالہ کیا جاتا ہے -

☆ ☆ ☆

مآخذ

اُردو

ابوالکلام آزاد : تبرکاتِ آزاد ، مرتبہ غلام رسول مہر ، کتاب منزل ، لاہور (س ۔ ن) ۔

اختر راہی : اقبال اور انور شاہ کاشمیری ، ''صحیفہ'' اقبال نمبر ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ۔ (۱۹۷۳ء)

: تذکرۂ مصنّفین درسِ نظامی ، مسلم اکادمی ، لاہور (۱۹۷۵ء) ۔

ادارۂ معارفِ اسلامیہ : روداد ادارۂ معارفِ اسلامیہ ، حصہ اوّل ، ادارۂ معارفِ اسلامیہ ، لاہور ۔

اسماعیل شہید ، شاہ : عبقات ، مترجمہ مناظر احسن گیلانی ، لجنۃ العلمیہ ، حیدرآباد ۔

اقبال : انوارِ اقبال ، مرتبہ بشیر احمد ڈار ، اقبال اکادمی ، کراچی (۱۹۶۷ء) ۔

: اقبالنامہ ، حصہ اول ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ ، شیخ محمد اشرف لاہور (۱۹۴۵ء) ۔

: پیام بہ ملّتِ کہسار ، مشمولہ اسلامی تعلیم

(اقبال نمبر) ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانگرس ، لاہور (مارچ تا جون ۱۹۷۴ء) -

: حرفِ اقبال ، مرتبہ لطیف احمد شروانی ، ثناء اللہ اینڈ سنز ، لاہور (۱۹۵۵ء) -

علم الاقتصاد ، اقبال اکیڈمی ، کراچی ، (۱۹۶۳ء) -

: فلسفۂ عجم (ترجمہ) ، نفیس اکیڈمی ، کراچی (۱۹۶۲ء) -

: کلیاتِ اقبال ، حصۂ فارسی ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور (۱۹۷۳ء) -

: کلیاتِ اقبال ، حصہ اردو ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور (۱۹۷۳ء) -

: مقالاتِ اقبال ، مرتبہ عبد الواحد معینی ، شیخ محمد اشرف ، لاہور (۱۹۶۳ء) -

: مقدمہ ''افغانستان'' (اردو ترجمہ) مشمولہ ماہِ نو ، اپریل ۱۹۵۸ء ، ادارۂ مطبوعات پاکستان ، کراچی (۱۹۵۸ء) -

: مکاتیبِ اقبال بنام سید سلیمان ندوی ، معارف ، جلد ۷۳ ، ۷۴ ، ۷۵ -

برکات احمد ٹونکی : الاتقان العرفان فی ماہیت الزمان ، مترجمہ محمود احمد برکاتی ، اقبال اکادمی ، کراچی (۱۹۶۸ء) -

حافظ شیرازی : دیوانِ حافظ ، سازمان کتابہائے جیبی ، تہران -

خیر الدین زرکلی : اعلام ، بیروت (س ۔ ن) (۱۹۶۷ء) ۔

سرور خان گویا اعتمادی : مقالاتِ یومِ اقبال ۔

سعید احمد اکبرآبادی : مولانا سیّد سلیمان ندوی (میری نظر میں) ، مشمولہ ''معارف'' سلیمان نمبر ، دارالمصنفین اعظم گڑھ (۱۹۵۴ء) ۔

سیّد سلیمان ندوی : ارمغانِ سلیمان ، مرتبہ غلام محمد ، ۱۰۹ ۔ عالمگیر روڈ ، شرف آباد ، کراچی (س ۔ ن) ۔

: اقبال کا علمِ کلام ، مشمولہ ''مقالاتِ یومِ اقبال'' ، قومی کتب خانہ ، لاہور (۱۹۳۸ء) ۔

: اقبال کا پیام اور اس کا متن ، مشمولہ ''جوہر'' (اقبال نمبر) ، جامعہ ملیہ ، دہلی (۱۹۳۸ء) ۔

: بریدِ فرنگ ، مکتبۂ الشرق ، کراچی (۱۹۵۲ء) ۔

: حیاتِ شبلی ، مطبع معارف ، اعظم گڑھ (۱۹۴۳ء) ۔

: سیرِ افغانستان ، نفیس اکیڈمی ، حیدرآباد (۱۹۴۵ء) ۔

: سیرتِ عائشہ ، مطبعِ معارف ، اعظم گڑھ (۱۹۴۶ء) ۔

: مکتوب بنام منشی عبد الرحمان خان ، مشمولہ ''اندازِ سخن'' ، تخلیق مرکز ، لاہور (۱۹۷۳ء) ۔

: مکتوب بنام ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ، مشمولہ ''اردو ادب'' ، دسمبر ۱۹۶۰ء -
: مکتوباتِ سلیمانی ، حصۂ اوّل ، مرتبہ عبد الماجد دریا بادی ، صدق بک ایجنسی ، لکھنؤ (۱۹۶۳ء) -
: مکتوباتِ سلیمانی ، حصۂ دوم ، مرتبہ عبد الماجد دریا بادی ، صدق بک ایجنسی ، لکھنؤ (۱۹۶۷ء) -
: معارف (اعظم گڑھ) ، اپریل ۱۹۱۸ء ، دسمبر ۲۰ء ، مارچ ۲۱ء ، مئی ۲۲ء ، جون ۲۳ء ، فروری ۲۴ء ، مئی ۲۷ء ، جون ۳۵ء ، مئی ۳۸ء ، مئی ۴۲ء ، جولائی ۱۹۴۳ء -
: یادِ رفتگاں ، مکتبۂ الشرق ، کراچی (۱۹۵۵ء) -

شبلی نعمانی : الکلام ، مطبعِ معارف ، اعظم گڑھ (۱۳۴۱ھ) -

غلام رسول مہر
صادق دلاوری } : سرودِ رفتہ ، کتاب منزل ، لاہور (۱۹۵۹ء) -

ظہیرالدین : اقبال کی کہانی -

عبدالسلام ندوی : اقبالِ کامل ، دارالمصنفین ، اعظم گڑھ ، (۱۹۶۴ء) -

عبدالقدوس ہاشمی : تقویمِ تاریخی ، مرکزی ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی ، کراچی (۱۹۶۵ء) -

عبدالمجید سالک : ذکرِ اقبال ، بزمِ اقبال ، لاہور (س ـ ن) -

غلام علی آزاد بلگرامی : سروِ آزاد ، کتب خانۂ آصفیہ ، دکن (۱۹۱۳ع) -

محمد حمزہ فاروقی : سفرنامۂ اقبال ، مکتبۂ معیار ، کراچی (۱۹۷۳ع) -

محمد عبداللہ چغتائی ، ڈاکٹر : اقبال اور سیّد سلیمان ندوی ، مکتبۂ نورس ، لاہور (۱۹۵۰ع) -

محمود احمد برکاتی : شاہ ولی اللہ اور آن کا خاندان ، تخلیق مرکز لاہور (۱۹۷۶ع) -

مسعود عالم ندوی : سیّد سلیمان ندوی ، مشمولہ ''چراغِ راہ'' ، اپریل ۱۹۵۳ع ، ماہنامہ ''چراغِ راہ'' ، کراچی -

وحیدالدین ، فقیر سیّد : روزگارِ فقیر ، حصہ اوّل ، لائن آرٹ پریس ، کراچی (۱۹۶۳ع) -

انگریزی

Iqbal : *Letters and Writings of Iqbal,* Edited by B. A. Dar, Iqbal Academy, Karachi.

Browne, E. G. : *A Literary History of Persia*, Cambridge.

Henry George Keene : *An Oriental Biographical Dictionary,* Sind Sagar Academy, Lahore.

☆ ☆ ☆

اشاریہ

مرتبہ

احمد رضا

اشخاص

ز

س

ش

ن

و

ہ

ی

مقامات ، ادارے

ڈ

ر

س

ش

ص

ط

ع

ہ

ی

☆ ☆ ☆

کتب ، رسائل ، اخبارات ، مضامین

الف

ب

پ

ت

ٹ

ق

ک

گ

ل

م

☆ ☆ ☆

نظمیں